سرپرست

مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

قبر دوسری زندگی کا دروازہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی شخص کے لئے اس دروازہ کو کھلتے ہوئے اور پھر اس کے اوپر اس کو بند ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ خود ان کے لئے بھی یہ دروازہ ایک روز کھولا جائے گا، اور پھر اسی طرح بند ہوگا جس طرح وہ دوسروں کے اوپر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ آدمی کی یہ نفسیات بھی کتنی عجیب ہے کہ دوسروں کو وہ ہر روز مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ ایک ایک کرکے روزانہ خدا کے یہاں پیشی کے لئے بلائے جا رہے ہیں۔ مگر خود اپنے کو اس طرح الگ کر لیتا ہے گویا عدالت الٰہی میں حاضری کا یہ دن اس کے اپنے لئے کبھی نہیں آئے گا۔
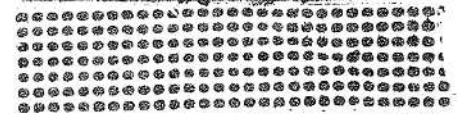
شمارہ ۱۰
ستمبر ۱۹۷۷

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

روزہ

اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، روزہ یہ ہے کہ آدمی علائق دنیا سے اپنے آپ کو کاٹ لے۔ اس قسم کی روزہ داری سے کیا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ انسانی وجود کا مادی پہلو کمزور ہو اور اس کی روحانیت بڑھے تاکہ عالم قدس سے اس کا اتصال ممکن ہو سکے۔ جسم کی مادی غذا کے مقابلہ میں روزہ کا مقصد روح کو معنوی غذا پہنچانا ہے۔

آدمی جب اپنے آپ کو مادی دنیا سے اٹھاتا ہے اور روحانی دنیا سے مربوط ہوتا ہے تو حیرت انگیز طور پر وہ محسوس کرتا ہے کہ علم حقیقت کا ایک نیا دروازہ اس کے سامنے کھل گیا ہے۔ وہ سارے واقعات جو مادی غلاف میں لپٹا ہونے کی وجہ سے اس کو دکھائی نہیں دیتے تھے، اب اسے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے جو انسان کی آخری معراج ہے۔

اسی راہ سلوک کا ایک مقام وہ ہے جب آدمی مادی غلاف سے اتنا زیادہ گزر جاتا ہے کہ عالم حقائق اس کو بالکل بے نقاب شکل میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ روزہ کی یہی حکمت ہے جس کی بنا پر قرآن میں، حکم روزہ کے درمیان، یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ بندوں کے قریب ہے اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے۔ (الاسلام ۴۳-۴۴)

فہرست

ماہنامہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی - ۶

عمل کی حقیقی سطح پر آدمی ناکام رہتا ہے، اور مصنوعی سطح پر کامیابی کے جھنڈے لہرا رہا ہے

امریکہ میں انسانی حقوق کے عنوان پر ایک بین اقوامی سیمینار ہو، اس کے لئے آپ کے پاس دعوت نامہ آئے، آپ ہوائی جہاز سے اڑ کر امریکہ پہنچیں اور وہاں شاندار اسٹیج پر ایک تقریری ریکارڈ دہرا دیں۔ تو یہ خبر فوراً اخبار میں چھپ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ کو آخرت کا ڈر ہے۔ اور جہنم کے اندیشے کے تحت آپ لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو یہ واقعہ کبھی اخبار کی سرخی نہیں بنے گا۔

آخر الذکر، عمل کی حقیقی سطح ہے ۔ اول الذکر، عمل کی مصنوعی سطح۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہر شخص، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، عمل کی مصنوعی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔ وہ ان امور میں تو خوب کارنامے دکھاتا ہے جن میں "نیوز ویلو" ہو، جن سے اس کی امیج بنتی ہو، جن میں عزت و جاہ کے استقبالئے وصول ہوتے ہوں، جن میں حق کی علم برداری کا عالمی کریڈٹ ملتا ہو، جو اس کو اخبار کی سرخیوں میں جگہ دینے والے ہوں ــــــ مصنوعی سطح کی چمک دمک نے لوگوں کو اتنا زیادہ اپنی طرف کھینچ رکھا ہے کہ عمل کی حقیقی سطح کی طرف توجہ دینے کی کسی کو فرصت نہیں۔

دوسری طرف لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی معاملہ پڑ جائے تو وہ کچے ثابت ہوں، کسی سے اختلاف پیدا ہو تو انصاف پر قائم نہ رہ سکیں، ان کی غلطیاں روز روشن کی طرح واضح ہو جائیں جب بھی وہ اعتراف نہ کریں۔ ایک مظلوم ان سے بے لاگ فیصلہ کی امید نہ کر سکے۔ خدا کی کھلی کھلی نشانیاں ظاہر ہوں مگر وہ عبرت نہ پکڑیں۔ وہ اپنے دل کو حسد، بغض، کینہ، نفرت، عصبیت سے پاک نہ کریں۔ وہ طاقت کے آگے جھک جائیں، مگر دلیل کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ خدا کی آیتیں سن کر ان کے دل نہ دہلیں اور آخرت کی جواب دہی کے خوف سے ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے نہ ہوں۔

لوگ عمل کی مصنوعی سطح پر کامیابی کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ اور عمل کی جو حقیقی سطح ہے وہاں ناکامی کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں ــــــ جلسوں اور کنونشنوں کی دھوم ہے، جہاد اور انقلاب کے نعرے لگ رہے ہیں۔ دوسری طرف خاموش تعمیری کام کا سارا میدان خالی پڑا ہوا ہے اور اس کے لئے کوئی نہیں اٹھتا۔

نبوت محمدی: انسانیت پر ایک عظیم احسان

بعثت کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ کسی عرب قبیلہ کا ایک شخص کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ آیا۔ وہ جب واپس گیا تو اس کے قبیلہ والوں نے پوچھا، مکہ کی کوئی خبر بتاؤ۔ اس نے جواب دیا:

محمد تنبأ و تبعه ابن ابی قحافة

محمدؐ نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور ابوقحافہ کا لڑکا ان کا ساتھ دے رہا ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۶۱۰ء میں جب آپ نے نبوت کا اعلان فرمایا اس وقت لوگوں کے ذہن میں آپ کی تصویر کیا تھی۔ آپ کے مخالفین اس زمانہ میں آپ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے، جس کا مطلب ہوتا تھا: فلاں دیہاتی کا لڑکا۔ کوئی زیادہ شریف زبان بولنا چاہتا تو کہتا: فتی من قریش، یعنی قبیلہ قریش کا ایک جوان۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال اپنے زمانہ میں تھا۔ مگر صدیاں گزرنے کے بعد اب صورت حال بالکل مختلف ہے۔ کیوں کہ اب آپ کی نبوت کوئی نزاعی مسئلہ نہیں۔ اب وہ ایک تسلیم شدہ واقعہ (ESTABLISHED FACT) کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آج جب ایک شخص کہتا ہے "محمد رسول اللہ" تو اس کے ذہن میں ایک ایسے پیغمبر کا تصور ہوتا ہے جس کے گرد ایک عظیم الشان تاریخ بن چکی ہے، جس کی پشت پر ڈیڑھ ہزار برس کی تصدیقی عظمتیں قائم ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ یہ تاریخ مکمل طور پر آپ سے الگ کر دی جائے اور نبی عربی دوبارہ "ابن ابی کبشہ" کی صورت میں ظاہر ہوں تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آپ پر ایمان لانے والوں کی تعداد جو آج کروروں میں گنی جاتی ہے، صرف درجنوں تک محدود ہو کر رہ جائے گی ــــ "ابن ابی کبشہ" کے حلیہ میں رسول خدا کو پہچان لینا انتہائی مشکل کام ہے۔ جب کہ یہی کام اس وقت انتہائی آسان ہو جاتا ہے جب رسول ایک مسلّمہ تاریخی حیثیت یا قرآن کے لفظوں میں مقام محمود (اسراء ــ ۷۹) کا درجہ حاصل کر چکا ہو۔

پچھلے ادوار میں نبیوں کے ہم زمانہ لوگوں کے لئے نبی کا انکار کرنے کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ یہی تھی ــــ "یہ تو وہی معمولی شخص ہے جس کو اب تک ہم فلاں بن فلاں کے نام سے جانتے تھے، وہ اچانک خدا کا پیغمبر کیسے ہو گیا" جب بھی کوئی نبی اٹھتا، یہ خیال ایک قسم کا شک اور تردد بن کر ان کے اوپر چھا جاتا، اور نبی کی پیغمبرانہ حیثیت کو پہچاننے کے معاملہ کو اس کے معاصرین کے لئے مشکل بنا دیتا۔

یہ صورت حال، خاتم النبیین کے ظہور سے پہلے، انسانیت کو مسلسل ایک کڑی آزمائش میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔ ہر بار ان کے اندر سے ایک نیا شخص خدا کے رسول کی حیثیت سے اٹھتا۔ مخاطب قوم کی اکثریت، مذکورہ نفسیاتی رکاوٹ کی وجہ سے، اپنے ہم عصر نبی کے بارے میں شک اور تردد میں پڑ کر انکار کر دیتی اور بالآخر سنت اللہ کے مطابق ہلاک کر دی جاتی۔

اب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسا نبی بھیجے جو ساری دنیا کے لئے رحمت کا دروازہ کھول دے۔ اس کی ذات پچھلے پیغمبروں کی طرح لوگوں کو اس آزمائش میں نہ ڈالے کہ "معلوم نہیں یہ واقعی پیغمبر ہے یا شخصی حوصلہ مندی

نے اس کو اس قسم کے دعوے پر آمادہ کر دیا ہے۔" اس کی نبوت ہر دور کے لوگوں کے لئے ایک مسلّمہ واقعہ کی حیثیت رکھتی ہو۔ لوگ کسی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہوئے بغیر اس کی "محمودیت"، کی وجہ سے اس کو پہچان لیں اور اس پر ایمان لاکر خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنیں۔

متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے افراد تمام دوسرے انبیار کی امتوں سے زیادہ ہوں گے۔ اس کا تعلق بھی اسی مسئلہ سے ہے۔ آپ کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اس لئے آپ کی امت میں آپ کے بعد دوبارہ کفر و اسلام کا مسئلہ کھڑا ہونے والا نہیں ہے۔ آپ کی امت بدستور بڑھتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

اس معاملہ کو بنی اسرائیل کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ حضرت مسیح کے زمانہ میں جو یہود تھے، وہ سب خدا کی شریعت پر ایمان رکھتے تھے وہ حضرت موسیٰ کے امتی تھے۔ مگر ابن مریم کی صورت میں جب ان کے اندر ایک نیا نبی اٹھا تو اس کو ماننا یہود کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ حضرت موسیٰ کو وہ اب بھی مانتے تھے۔ مگر اپنے ہم عصر نبی کا انکار کر رہے تھے۔ اس کی وجہ سے، ایک درجن مومنین مسیح کو چھوڑ کر، سارے کے سارے یہودی کافر قرار پا گئے۔ حضرت مسیح کے چھ سو برس بعد جب نبی عربی کی بعثت ہوئی تو مسلمانوں کی اس نئی جماعت (عیسائیوں) کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ مگر دوبارہ وہی ہوا کہ نئے "اسماعیلی نبی" کو ماننے کے لئے وہ اپنے کو آمادہ نہ کر سکے۔ وہ تاریخی نبی (حضرت مسیح) پر بدستور ایمان رکھتے تھے۔ مگر اپنے ہم عصر نبی (حضرت محمدؐ) کے منکر تھے۔ اس کی وجہ سے دوبارہ ایسا ہوا کہ نبوت محمدی پر ایمان لانے والے چند عیسائیوں کو چھوڑ کر پوری عیسائی قوم کو کافر قرار دے دیا گیا۔

ختم نبوت کی وجہ سے امت محمدی میں اس قسم کی چھٹنی، کم از کم موجودہ دنیا میں، دوبارہ ہونے والی نہیں۔ اس لئے آپ کے امتیوں کی تعداد بھی دوسرے انبیار کے پیروؤں سے زیادہ رہے گی —— یہ بھی ایک پہلو ہے آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا جو اس لئے حاصل ہوا کہ اللہ تعالے نے آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا۔ مقام محمود دنیوی اعتبار سے یہ ہے کہ آپ کی نبوت کو ساری دنیا کے لئے ایک تاریخی مسلّمہ بنا دیا گیا۔ یہی تعریفی حیثیت قیامت کے دن خصوصی خداوندی اعزاز کی صورت میں ظاہر ہو گی جو اولین و آخرین میں آپ کے سوا کسی کو حاصل نہ ہو گی۔

مگر کسی نبی کو مقام محمود پر کھڑا کرنا سادہ طور پر محض نامزدگی کا معاملہ نہ تھا۔ یہ ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لانے کا معاملہ تھا۔ اس کے لئے ایک طرف ایسی معیاری شخصیت درکار تھی جیسی کوئی دوسری شخصیت بنی آدم میں پیدا نہ ہوئی ہو دوسری طرف ایسی قربانی اور حوالگی درکار تھی جیسی قربانی و حوالگی کا ثبوت کسی دوسرے انسان نے نہ دیا ہو۔ یہی وہ نازک لمحہ تھا جب کہ خدا نے اپنے ایک بندے کو پکار کر کہا: يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ ۔ ۔ ۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۔ اور کمبل میں لپٹی ہوئی اس عظیم روح نے لبیک کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن خدائی منصوبہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد طویل عمل کے نتیجہ میں بالآخر وہ نبوت ظہور میں آئی جو سارے عالم کے لئے رحمت بن گئی۔ جس نے انسانی تاریخ میں بار بار نئے نبیوں کی آمد کے آزمائشی دور کو ختم کیا اور ایک مسلّمہ نبوت کے دور کا آغاز کر کے لوگوں کے لئے خدا کی رحمتوں میں فوج در فوج

داخل ہونے کا دروازہ کھول دیا۔

نبوت کو تاریخی مسئلہ بنانے کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ آئندہ کے لئے نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند ہو جائے۔ مگر یہ بھی محض اعلان کا معاملہ نہ تھا۔ ختم نبوت سے پہلے ضروری تھا کہ چند شرائط لازمی طور پر پوری ہو چکی ہوں:

۱۔ زندگی کے تمام معاملات کے لئے احکام خداوندی کا نزول (اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ)

۲۔ انسانی کردار کے لئے ایک کامل نمونہ سامنے آجانا (لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ)

۳۔ وحی الٰہی کی دائمی حفاظت کا انتظام (نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک فیصلہ کے ذریعہ ان تینوں شرائط کی تکمیل کا انتظام فرما دیا۔

پچھلے نبیوں کے لئے اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ہر نبی کو کچھ آیات (معجزے) دیئے جاتے تھے۔ نبی اپنی مخاطب قوم میں تبلیغ و دعوت کا فریضہ آخری حد تک ادا کرتا۔ وہ غیر معمولی نشانیوں کے ذریعہ اپنے نمائندہ الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کرتا۔ اس کے باوجود جب لوگ ایمان نہ لاتے تو نبی کا کام ختم ہو جاتا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فرشتے متحرک ہوتے اور زمینی یا آسمانی عذاب کے ذریعہ اس قوم کو ہلاک کر دیتے۔

نبی آخر الزماں کے لئے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوا کہ آپ کی مخاطب قوم کے لئے اس قسم کا عذاب نہیں آئے گا۔ بلکہ خود نبی اور آپ کے اصحاب کو ان سے ٹکرا کر انھیں مجبور کیا جائے گا کہ وہ دین خداوندی کو قبول کریں (تقاتلونھم اویسلمون) اس کے باوجود ان میں سے جو لوگ اطاعت نہ کریں وہ اہل ایمان کی تلواروں سے قتل کر دیئے جائیں (قَاتِلُوْھُمْ یُعَذِّبْھُمُ اللّٰہُ بِاَیْدِیْکُمْ) دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس سے پہلے جو کام فرشتے کرتے تھے، اس کو انسانوں کے ذریعہ انجام دیا جائے۔

اسی فیصلۂ الٰہی کا نتیجہ تھا کہ ہجرت اور اتمام حجت کے بعد، دیگر انبیاء کی قوموں کے برعکس، اہل عرب پر کوئی جوالا مکھی پہاڑ نہیں پھٹا اور نہ آسمان سے آگ برسی۔ بلکہ رسول اور اصحاب رسول کو ان کے ساتھ ٹکرا دیا گیا۔ اس فوجی تصادم میں اللہ کی خصوصی نصرت کے ذریعہ رسول اور آپ کے اصحاب کو فتح حاصل ہوئی۔ خدا کا دین ایک باقاعدہ اسٹیٹ کی شکل میں جزیرہ نمائے عرب پر قائم ہو گیا۔

اس واقعہ کے مختلف نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ دعوت نبوت کو، انفرادی تقاضوں سے لے کر اجتماعی معاملات تک، زندگی کے تمام مراحل سے گزرنا پڑا اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے مسلسل احکام اترتے رہے۔ اگر یہ واقعات پیش نہ آتے تو اسلامی شریعت میں ہر قسم کے احکام نہیں اتر سکتے تھے۔ کیونکہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ حالات کے لحاظ سے اپنے احکام بھیجتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کتابی مجموعہ کی شکل میں بیک وقت سارے احکام لکھ کر نبی کو دے دیئے جائیں۔ فرشتوں کے ذریعے منکرین عرب کا استیصال کرنے کے بجائے اہل ایمان کی تلوار کے ذریعہ ان کو زیر کرنے کے فیصلے نے دین کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیئے۔

پھر اسی کی وجہ سے یہ امکان پیدا ہوا کہ پیغمبر کا سابقہ زندگی کی تمام صورتوں سے پیش آئے۔ اور ہر قسم کی

سرگرمیوں میں وہ اسلامی کردار کا عملی نمونہ دکھا سکے۔ اس کے بعد خود حالات کے ارتقاء کے تحت ایسا ہوا کہ نبی کو مسجد اور مکان سے لے کر میدان جنگ اور تخت حکومت تک ہر جگہ کھڑا ہونا پڑا اور ہر جگہ اس نے معیاری انسانی کردار کا مظاہرہ کر کے قیامت تک کے لوگوں کے لئے نمونہ قائم کر دیا۔

پھر اسی واقعہ نے قرآن کی حفاظت کی صورتیں بھی پیدا کیں۔ پچھلی آسمانی کتابیں جو محفوظ نہ رہ سکیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کے بعد ان کتابوں کی پشت پر کوئی ایسی طاقت نہ رہی جو بزور ان کو ضائع ہونے سے بچاتی۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے اپنی ہم عصر قوموں سے مقابلہ کر کے اولاً عرب اور اس کے بعد قدیم دنیا کے بڑے حصہ پر اسلام کا غلبہ قائم کر دیا۔ اس طرح کتاب الٰہی کو حکومتی اقتدار کا سایہ حاصل ہو گیا جو خدا کی کتاب کو محفوظ رکھنے کی یقینی ضمانت تھا۔ یہ انتظام اتنا طاقت ور تھا کہ ایک ہزار برس تک اس میں کوئی فرق نہ آسکا۔ اسلامی اقتدار کے زیر سایہ قرآن ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا۔ یہاں تک کہ صنعتی انقلاب ہوا اور پریس کا دور آگیا جس کے بعد قرآن کے ضائع ہونے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ سب جو ہوا، اس طرح ٹھنڈے ٹھنڈے نہیں ہو گیا جیسے آج ہم اس کو سیرت و تاریخ کی کتابوں میں پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے لئے نبی اور آپ کے ساتھیوں کو ناقابل برداشت طوفان سے گزرنا پڑا۔ کفار کے مطالبہ اور نبی کی خواہش کے باوجود ان کو فوق الفطری معجزے نہیں دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اپنے اخلاق و کردار کو معجزاتی واقعات کا بدل بنانا پڑا۔ ان کے مکذبین کے لئے کوئی ارضی و سماوی عذاب نہیں آیا۔ اس طرح انھیں وہ کام کرنا پڑا جس کے لئے پہلے بھونچال آتے تھے اور آتش فشاں پھٹتے تھے۔ ختم نبوت کے فیصلہ کے باوجود کتاب الٰہی کو یکبارگی ان کے حوالے نہیں کیا گیا۔ اس لئے ان کے واسطے ضروری ہو گیا کہ وہ زندگی کے وسیع سمندروں میں کو دیں اور ہر قسم کی چٹانوں سے ٹکرائیں تاکہ تمام معاملات زندگی کے بارے میں ان پر احکام الٰہی کا نزول ہو سکے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس پورے عمل کے دوران نبیؐ اور آپ کے اصحاب امتحان کے اس انتہائی کڑے معیار پر تھے جس کو قرآن میں زلزال شدید (احزاب۔ ۱۱) کہا گیا ہے۔ نبیؐ کو سخت ترین حکم تھا کہ ظالموں کی طرف ادنیٰ جھکاؤ بھی مت دکھاؤ (اسراء۔ ۷۵) ورنہ تم کو دگنی سزا دی جائے گی۔ حالات خواہ کتنے ہی شدید ہوں، آپ کے ساتھیوں کے لئے کسی بھی حال میں تخلف (توبہ۔ ۱۱۹) کی اجازت نہ تھی۔ آپ کی ازواج اگر دو وقت کی روٹی کا بھی مطالبہ کریں تو ان کے لئے یہ صاف جواب تھا کہ — پیغمبر کی صحبت اور دنیا میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کر لو (احزاب۔ ۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ نبوت محمدی کو بروئے کار لانا انسانی تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اور یہ سب کچھ اتنی قیامت خیز سطح پر ہوا کہ خود رسول کی زبان سے نکلا کہ "اس راہ میں مجھ کو اتنا ستایا گیا جتنا کسی دوسرے نبی کو نہیں ستایا گیا"۔ آپ کی رفیقۂ حیات نے شہادت دی کہ لوگوں نے آپ کو روند ڈالا تھا (حین حطمہ الناس) خاتم النبین اور آپ کے ساتھیوں نے دنیا کا آرام تو درکنار زندگی کی ناگزیر ضرورتوں سے بھی اپنے کو محروم کر لیا، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ تاریخ میں اس نبوت کا دور شروع ہو جس کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔

نبی عربیؐ کا آپ کے بعد آنے والی نسلوں پر یہی وہ احسان عظیم ہے جس کی وجہ سے دائمی طور پر آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاریخ کے اس مشکل ترین مشن میں چونکہ آپ کے اہل خاندان نے آپ کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور آپ کے اصحاب اس صبر آزما جدوجہد میں پوری طرح صادق القول اور صابر العمل ثابت ہوئے، اس لئے رسولؐ کے ساتھ آپ کے آل اور آپ کے اصحاب کے لئے بھی رحمت اور سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کے اوپر احسان کرے تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس پر شکر کا اظہار کیا جائے۔ درود و سلام اسی قسم کے ایک عظیم ترین احسان کا دعا کی شکل میں اعتراف ہے۔ حدیث میں ہے: البخیلُ مَن ذُکرتُ عندہ فلم یُصَلِّ عَلَیَّ (نسائی، ترمذی)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّم

سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے۔ "خدا تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا"۔ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں یہ خداوندی اطلاع مکی دور کے آخری سال نازل ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ آپ کی مظلومیت اور بے سروسامانی اپنی آخری انتہا کو پہنچ گئی تھی، حتیٰ کہ آپ کے مخالفین آپ کے قتل کی تدبیریں کرنے لگے تھے۔ آپ کو محمدؐ (تعریف کیا ہوا) کے بجائے مذمم (مذمت کیا ہوا) کہتے تھے۔

اس وقت خبر دی گئی کہ مخالفین اسلام اپنے وقتی اقتدار سے خوش نہ ہوں۔ محمدؐ بن عبداللہ کا معاملہ کوئی انسانی معاملہ نہیں۔ یہ تمام تر خدائی معاملہ ہے۔ خدا بہر حال اپنے منصوبہ کو پورا کر کے رہے گا، خواہ منکرین اس کے خلاف کتنی ہی کوششیں کر ڈالیں۔ نبی عربیؐ کے ساتھ یہ نہیں ہونا ہے کہ وہ گمنامی کے ساتھ اس دنیا سے چلے جائیں، جیسا کہ اکثر نبیوں کے ساتھ ہوا۔ خدا اپنے نبیؐ کو مکہ سے نکال کر یثرب لے جائے گا اور وہاں اس کے لئے مرکز فراہم کرے گا۔ اس کو اقتدار عطا فرمائے گا جس کے ذریعہ سے وہ باطل کو شکست دے گا۔ مخصوص خدائی مصالح کے تحت ان کو اس حد تک کامیاب بنانا ہے کہ وہ محمود خلائق ہو جائیں۔ ان کو مذمم کہنے والے بہت جلد اپنی زندگی ہی میں ان کو حقیقی معنوں میں محمد اور محمود بنتے ہوئے دیکھیں گے — نبی عربیؐ کے بارے میں خدا کا یہ منصوبہ مکمل طور پر پورا ہوا۔ حتیٰ کہ وہ اس قابل ہو سکے کہ دین خداوندی کی بنیاد پر ایک نئی تاریخ وجود میں لا سکیں۔

خدا کے رسولؐ جس طرح دنیا میں لوگوں کے درمیان محمود و ممدوح قرار پائے، اسی طرح میدان حشر میں بھی وہ لوگوں کے درمیان مقام محمود پر فائز ہوں گے۔ محمودیت کے اس آخری اور کامل اظہار کا نام مقام شفاعت ہے۔ دنیا میں آپ کے ذریعہ انسانیت کو ایک عظیم امتحان سے نجات ملی۔ آخرت میں بھی اللہ آپ کے وسیلہ سے لوگوں کو حشر کی ہولناک آزمائش سے نکالے گا اور بلاشبہ یہ ایک ایسا اعزاز ہو گا جو اولین و آخرین میں کسی کو حاصل نہیں۔

خارجی ہدایت کی ضرورت

انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ مگر اس کو نہیں معلوم کہ وہ اپنی آزادی کو کس طرح استعمال کرے۔ کائنات کی غیر ذی روح اشیاء قانون فطرت کے تحت اپنا عمل کر رہی ہیں اور ذی روح اشیاء جبلت کے تحت۔ ساری معلوم دنیا میں یہ صرف انسان ہے جس کو اپنی زندگی کا نقشہ خود بنانا ہوتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ انسان، اپنی ساری اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود یہ نہیں جانتا کہ اپنی زندگی کا نقشہ کس طرح بنائے۔ ایک انتہائی مکمل کائنات کے اندر انسان ایک نامکمل وجود ہے۔

کائنات میں کوئی چھوٹے سے چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں جو بقیہ کائنات سے الگ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام بنانے کے لیے پوری کائنات کا علم درکار ہے۔ انسان اس عظیم کائنات کا محض ایک جزوی حصہ ہے مگر اس جزو کو سمجھنا بھی اسی وقت ممکن ہے جب کہ کل کے بارہ میں ہم کو پورا علم حاصل ہو چکا ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کسی بھی زمانہ میں اس قابل نہ ہو سکا کہ وہ حقائق عالم کا احاطہ کرلے۔ اور اب تو سائنس نے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر انسان کے لیے اس قسم کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔

پانی کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے بن جاتا ہے۔ جانوروں کو ان کی جبلت ایک متعین راہ پر چلاتی رہتی ہے۔ بالفرض ایسا نہ ہو، جب بھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ پانی یا جانور فطری طور پر صحیح اور غلط کے احساس سے خالی ہیں۔ ان کی دنیا میں وہی ٹھیک ہے جو بالفعل وقوع میں آجائے۔ اس کے برعکس انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ صحیح و غلط، بالفاظ دیگر اخلاقی احساس اس کی فطرت میں اس طرح پیوست ہے کہ وہ کسی بھی طرح اپنے آپ کو اس سے جدا نہیں کر سکتا۔ مگر آدمی جب اپنے اخلاقی احساس کو خارجی طور پر متعین کرنا چاہتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ انسان اپنے موجودہ حواس کے تحت کسی ایسی ہی چیز کو قطعیت کے ساتھ جان سکتا ہے جو ہماری نسبت سے اپنا کوئی معروضی مقام (OBJECTIVE STATUS) رکھتی ہو۔ جب کہ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں معروضی اقدار (OBJECTIVE VALUES) کا کوئی وجود نہیں۔

انسان اپنی زندگی کی تشکیل کے لیے جو بھی قدم اٹھاتا ہے، فوراً دو سوال اس کے سامنے

آکر کھڑے ہو جاتے ہیں ــــــ اس کے عمل کا نقطۂ آغاز (STARTING POINT) کیا ہو۔ اور یہ کہ اس کے عمل کی حدود (LIMITATIONS) کیا ہیں۔ ان دونوں سوالات کے جواب پر ہی اس کے عمل کی صحت موقوف ہے۔ مگر انسان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے وہ ان دونوں سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب معلوم کر سکے۔

مثال کے طور پر عورت مرد کے باہمی تعلق کے مسئلہ کو لیجیے۔ دور جدید کے انسان نے اس معاملہ کا نقطۂ آغاز دونوں جنسوں کے درمیان کلی مساوات کو سمجھا۔ مگر طویل تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں ایسی حیاتیاتی اور نفسیاتی رکاوٹیں ہیں کہ موجودہ نظام تخلیق کے باقی رہتے ہوئے دونوں کے درمیان کلی مساوات ممکن ہی نہیں۔ اس طرح غلط نقطۂ آغاز سے چلنے کی وجہ سے نہ صرف بےشمار انسانی وسائل ضائع ہو گئے بلکہ ایسے نئے نئے سماجی اور خاندانی مسئلے پیدا ہو گئے جن کا کوئی حل اب انسان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

اسی طرح اٹھارویں صدی میں مشینی طاقت کی دریافت کے بعد جب جدید صنعتی نظام وجود میں آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ کارخانہ کی ملکیت اب سادہ معنوں میں صرف ملکیت نہیں رہی بلکہ اقتصادی استحصال کے ہم معنی ہو گئی ہے۔ اس سے روایتی افکار کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی۔ جو بالآخر یہاں تک پہنچی کہ خود انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے منسوخ کر دیا گیا۔ تاہم آباد دنیا کے تقریباً نصف حصہ پر آدھی صدی تک تجربہ کرنے کے بعد آخری بات جو انسان کو معلوم ہوئی وہ یہ کہ تنسیخ ملکیت محض ردعمل کے جذبات کے تحت ایک انتہاپسندانہ کاروائی تھی جس نے دوسرا شدید تر استحصالی نظام وجود میں لانے کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا۔ اب تمام دنیا کے اہل فکر یہ سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ شاید زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ ملکیتوں کی تنسیخ کے بجائے استحصال کی تنسیخ کی جاتی۔

ایک اور مسئلہ ہے جو مذکورہ بالا دونوں مسئلوں سے بھی زیادہ اہم ہے۔ تمام دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان کے اندر ایک حیرت انگیز داعیہ یہ ہے کہ وہ کل (TOMORROW) کا تصور رکھتا ہے وہ صرف "آج" پر قانع نہیں۔ اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری موجودہ زندگی انتہائی مختصر ہے اور اس کی خوشیاں اور کامیابیاں بےحد معمولی ہیں۔ جب ہم وہ سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں تو موت کا وقت قریب آجاتا ہے ــــ حالیہ دور میں ٹکنیکی انقلاب کے بعد جب انسان نے دیکھا کہ اس کے اوپر عیش و راحت کے ایسے دروازے کھل گئے ہیں جو پچھلے انسان نے خواب میں بھی نہ دیکھے تھے تو سمجھ لیا گیا کہ بس یہی موجودہ زندگی ہی سب کچھ ہے

اور یہاں عزت اور خوشی حاصل کر لینا ہی انسان کی اصل کامیابی ہے۔ مگر انسان ایک صدی بھی اس نئے امکان سے محظوظ نہ ہو سکا تھا کہ نئے نئے مسائل مثلاً صنعت کی پیدا کردہ کثافت (INDUSTR IAL POLLUTION) نے اس کی زندگی کو بالکل تلخ کر دیا۔ ایک طرف "اینٹی سائنس" تحریک مختلف شکلوں میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسری طرف نفسیاتی تحقیقات نے یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ زندگی ایک ایسا مظہر ہے جو جسمانی موت کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتا ہے حتیٰ کہ علم الموت (THANATALOGY) کے نام سے سائنس کی ایک نئی شاخ وجود میں آ گئی ہے جو اس امکان کی تحقیق میں سرگرم ہے کہ کیا موت اور زندگی دونوں ایک دوسرے کے حصّے (PART) ہیں۔ ان واقعات نے دوبارہ انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے لیے کسی صحیح تر فلسفہ حیات کی تلاش کرے۔

اوپر جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا، اس کی صرف دو توجیہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ انسان ایک مکمل کائنات کے اندر ایک نامکمل وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایسے کائناتی تضاد کی علامت ہے جس کا کوئی حل معلوم دنیا کے اندر ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس تضاد کا بھی حل ہے یا کم از ہو سکتا ہے۔ تجرباتی علوم کے پاس دونوں توجیہات میں سے کسی کے حق میں کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں۔ تاہم عقلی قیاس یہ کہتا ہے کہ دوسری توجیہہ کو صحیح ہونا چاہیے کیونکہ یہ عظیم کائنات جس طرح قانون فطرت اور جبلّت کے تحت انتہائی منظم طور پر چل رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناقابل قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس سے کمتر درجہ کے ایک سوال کا جواب اس کے پاس نہ ہو — جو تخلیقی قوت عالم افلاک کے مہیب نظام کو گردش دے رہی ہے اور ذی روح اشیاء کی انتہائی پیچیدہ زندگی کو پوری کامیابی کے ساتھ بروئے کار لانے میں مصروف ہے، وہ اس کے مقابلہ میں ایک بہت چھوٹے مسئلہ کا حل اپنے پاس نہ رکھتی ہو، یہ کسی طرح قابل فہم نظر نہیں آتا۔ انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ بطور خود اپنا فلسفہ حیات دریافت کر سکے مگر خارجی قرائن کہتے ہیں کہ کائنات میں اس انسانی طلب کا انتظام ہونا چاہیے، جس طرح دوسری بے شمار ضرورتوں کا مکمل انتظام اس کے اندر موجود ہے۔

یہ واقعہ انسان کے لیے خارجی ہدایت کی ضرورت ثابت کرتا ہے اور خارجی ہدایت ہی کا دوسرا نام وحی والہام ہے۔

فطرت میں توازن کا اصول

زمین کی رنگا رنگ اور متنوع شکل بڑی حد تک ان حشرات الارض، نباتات اور حیوانات کی پیدا کردہ ہے جو اس کی بے جان چٹانوں اور گیسوں کو لاتعداد قسم کے پیچیدہ مرکبات میں لگاتار تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو فطرت کے کام میں خلل اندازی کر کے اکثر تباہ کن حالات پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ کس طرح زراعت اور صنعت کی بدانتظامی سے توازنِ فطرت میں لگاتار رونما ہوا ہے۔ جون ۱۹۷۲ء میں اسٹاک ہوم میں انسانی ماحول سے متعلق اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایسے عالمی طریق کار وضع کئے جائیں جن سے انسان کی ارضی بدانتظامی سے پیدا ہونے والے ماحولی نقائص کا انسداد ممکن ہو سکے۔

ڈاکٹر بیری کامنر نے توازن فطرت سے متعلق اپنے چوتھے قانون کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے: "فطرت کی دانش افضل ترین ہے"۔ جب ماحول کو جوں کا توں چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے آپ ایک متوازن حالت پر آنے لگتے ہیں۔

ایسے متوازن حالات میں قدرت کے تمام فضلات پھر نئے سرے سے فطرت کی گردش میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر درختوں کے سوکھے پتے اور ٹہنیاں حشرات الارض کے کام آتی ہیں جو ان کے عناصر ترکیبی کو معدنی و مرکباتی غذاؤں کی شکل میں زمین کو واپس کرتے ہیں اور ان مرکبات کے سہارے اس جنگل میں مزید نباتات اگتی جاتی ہیں۔ اس طرح وہاں توازن فطرت کا نظام برقرار رہتا ہے۔ کچھ جانوروں جیسے لیمنگ، چھچھوندر اور خرگوش کی تعداد میں بار بار جو اچانک بھاری کمی ہوتی ہے، اس کا سبب بھی یہی قدرتی عمل ہے جس کے ذریعہ کھلی فطرت میں جانداروں کی تعداد پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یہ متعلقہ جانوروں کی آبادی اور مقامی وسائل کے درمیان پھر سے توازن قائم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ انسان جب تیل، کوئلہ وغیرہ کو نکال کر جلاتا ہے تو وہ بھی گویا اس گردش کو مکمل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ ان ایندھنوں کے کاربن اور دیگر معدنیات کو پودوں کی نشوونما کے لئے پھر سے مہیا کرتا ہے۔

قدیم زمانہ میں انسان اپنی مختلف سرگرمیوں کے دوران جو فضلات پیدا کرتا تھا، قدرت ان کو ری سائیکل کر کے دوبارہ ان کو مفید شکل میں تبدیل کر دیتی تھی۔ مشینی صنعت کے دور میں پہلی بار یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ انسان ایسے کیمیاوی مرکبات وجود میں لا رہا ہے جن کو ری سائیکل کرنے کا انتظام قدرت کے ڈھانچہ میں نہیں۔ چنانچہ دور جدید کے ماہرین یہ کہہ رہے ہیں کہ انسان کو اگر اس زمین پر صحت و عافیت کے ساتھ رہنا ہے تو اس کو اپنی عادتوں میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔

یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ انسان اس زمین پر آزاد اور خود مختار نہیں ہے۔ وہ خدا کا بندہ ہے۔ اس کو اسی طرح زندگی گزارنی ہے جس طرح اس کا خدا چاہے۔ اگر وہ خدائی نقشہ کے خلاف چلے گا تو بربادی کے سوا کہیں اور نہیں پہنچ سکتا۔

بے شمار بھڑکتے ہوئے ستاروں کی اس وسیع کائنات میں زمین ایک حیرت انگیز استثناء ہے۔ اس کا احساس آدمی کو اس وقت ہوگا جب اس ہرے بھرے کرہ کو اس سے چھین لیا جائے گا۔ اس وقت آدمی دیکھے گا کہ زمین کے باہر اس کے استقبال کے لئے آگ کے ہولناک شعلوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

تاہم گردش نو کی اس انسانی شکل میں یہ خرابی ہے کہ ان ایندھنوں کی باقیات کو ہوا، پانی اور زمین کے ذریعہ پھر سے فطری گردش میں ڈالنے کا عمل اتنی زیادہ تیزی سے ہوتا ہے کہ وہ آج کے توازن فطرت پر ایک بوجھ بن جاتے ہیں۔

گوانو (GUANO) نام کے مادہ کا جمع ہونا بھی فطرت کا ایک عجیب کارنامہ ہے۔ یہ مادہ جو اب کھاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے، بیٹ پر مشتمل ہے جو پرندوں نے لاکھوں سال تک بعض جزیروں اور پہاڑی چوٹیوں پر ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر کروڑوں سمندری پرندے پیرو کے ساحل سمندر کے قریب واقع جزائر چنچا کو اپنے بسیرے اور انڈے دینے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں ان کی بیٹ جو صدیوں سے جمع ہوتی رہی ہے۔ گوانو کی تہوں میں بدل گئی ہے جو ۱۸ سے ۳۰ میٹر تک اونچی ہیں۔ یہ گوانو (بیٹ) چونکہ نائٹروجن، فاسفیٹ اور پوٹاش سے بھر پور ہے، اس لئے یہ نہایت اعلیٰ قسم کی کھاد ہے۔ اور اس کا جمع ہونا مقامی باشندوں کے لئے ایک عجیب و غریب نعمت ہے جو اس کو جمع کر کے کھیتوں میں ڈالتے ہیں۔ اس طرح یہ پودوں کی خوراک بن کر پھر سے حیاتیاتی گردش میں شامل ہو جاتی ہے

ٹھوس فضلات کا مسئلہ اب بے حد سنگین ہو گیا ہے۔ کیونکہ ہم ماضی کی نسبت اب کہیں زیادہ فضلہ پھینکتے ہیں اور وہ عام طور سے ایسے کیمیاوی مرکبات پر مشتمل ہوتا ہے جو قدرتی نظاموں میں نہیں پائے جاتے۔ اب فطرت نہیں جانتی کہ اس نئی صورت حال سے جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ہے کیسے نپٹا جائے۔ ان ٹھوس فضلات کے مسئلہ کا حل فطرت کے اپنے طریقوں میں نہیں نکل سکتا اس کے لئے نئے ٹکنالوجیکل طریقے اور انسان کی جبلی طرز عمل میں تبدیلیاں ضروری ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ کئی قدیم تہذیبوں نے اپنے ماحول کو تباہ کیا ہے اور یہ کہ کچھ ایسا ہی عمل اب انتہائی صنعتی ترقی والے علاقوں میں ہو رہا ہے۔ بنی نوع انسان کو، مستقبل کی خاطر، اس زمین کے نگہبان کے طور پر عمل کرنا ہے۔

انسان نے اپنی محنت سے ارضی مناظر میں اضافہ کی کوشش کی ہے۔ کھیت، باغ، پارک، مصنوعی جھیلیں اس کی شکل ہیں۔ تاہم انسان کی دست اندازی سے پہلے زمین پر لامتناہی سبز چادر کا جو منظر پھیلا ہوا تھا۔ کوئی انسانی پارک اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ فطرت کے جنگلوں کی عجیب روشنیاں حیرت و استعجاب کی ایسی کیفیت پیدا کرتی ہیں جو کسی پھلوں کے باغیچے یا گلستاں میں محسوس نہیں کی جا سکتی۔ سمندر کی وسعت اور اس کی لہروں کے لامتناہی مدو جزر میں ایک پر اسرار خوبی نظر آتی ہے جو انسان کے بنائے ہوئے ماحول میں ممکن نہیں۔ قدرت کا حسن آفاقی حسن ہے، جب کہ انسان کا بنایا ہوا حسن محدود حسن ہوتا ہے۔ اور محدود حسن کبھی آفاقی حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صبح کی سنہری شعاعوں یا شام کی رنگین شفق کے پس منظر میں چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ اڑنے سے جو اتھاہ حسن پیدا ہوتا ہے کون ہے جو اس کو دہرا بھی سکے، اس سے بہتر حسن کو وجود میں لانے کا تو سوال ہی کیا۔

ہمارے پاس اسلامی کتابوں کا ایک ایساسٹ ہونا چاہیئے جو اسلام کے مکمل مطالعہ کے لئے کسی کو دیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں علوم اسلامی کی تدوین کی ایک تجویز یہ ہوسکتی ہے :

قرآن

١ غیر عربی دانوں کے لئے ترجمہ (بغیر تفسیر) شائع کرنا، مختلف زبانوں میں۔
٢ قرآن میں مذکور انبیاء اور قوموں کے حالات تاریخی انداز سے مرتب کرنا، قدیم معلومات اور جدید اثریات کی مدد سے۔
٣ قرآن میں مظاہر کائنات کے جو حوالے ہیں، ان کی تفصیلات جدید علوم کی مدد سے۔
٤ قرآن کی تعلیمات کتابی ابواب کی صورت میں۔

حدیث

ضعیف اور موضوع روایتوں کو الگ کر کے تمام قوی الاسناد روایات کو چند الگ الگ مجموعوں میں اکٹھا کر دیا جائے۔ مثلاً :

٥ تفسیری روایات
٦ واقعاتی روایات
٧ احکامی روایات
٨ تذکیری روایات

سیرت

٩ پیغمبر اسلام، صرف غزوات نہیں بلکہ مکمل سیرت، سادہ تاریخی اور واقعاتی انداز میں۔
١٠ حالات صحابہ، مکمل حالات، صرف غزوات کے نہیں بلکہ پوری زندگی کے بارہ میں۔
١١ تاریخ اسلام (صرف فتوحات اسلام نہیں بلکہ مکمل تاریخ)

معاون کتابیں

١٢ صحف سماوی (تاریخ اور تعارف)
١٣ اعلام الاسلام (اسلامی شخصیتوں کی ڈکشنری)
١٤ قاموس الاسلام (مختصر اسلامی انسائیکلوپیڈیا)
١٥ معجم الحدیث (حدیث کے مندرجہ بالا مجموعوں کا مکمل انڈکس)
١٦ تاریخ دعوت اسلام (آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کے انداز پہ زیادہ جامع کتاب)

علوم اسلامی کی تدوین

عقبہ بن نافع تابعی (۶۲ھ) یزید بن معاویہ کی خلافت کے زمانہ میں افریقہ میں اسلامی فوجوں کے سپہ سالار تھے۔ وہ مغربی افریقہ کے ملکوں کو فتح کرتے ہوئے اٹلانٹک کے ساحل تک پہنچ گئے۔ شہر اسفی ان کی آخری منزل تھی۔ وہاں انھوں نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا اور اس کے پانی میں کھڑے ہو کر کہا:

اللھم انی لو اعلم وراء ھذا البحر بلدا لخضته الیه حتی لا یعبد احد دونك

خدایا، اگر میں جانتا کہ اس سمندر کے اُس پار بھی کوئی ملک ہے تو میں سمندر میں گھس کر وہاں جاتا یہاں تک کہ تیرے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

وہ لوگ جو دور اول میں قرآن پر ایمان لائے، اور جنھوں نے براہ راست پیغمبر خدا سے تربیت حاصل کی تھی، ان کے اندر سب سے زیادہ ابھرا ہوا جذبہ یہی تھا کہ وہ خدا کے پیغام کو خدا کے تمام بندوں تک پہنچا دیں۔ ان کا یہ جذبہ اس وقت تک تھمتا ہوا نظر نہ آتا تھا جب تک سارے جہان کے لوگوں کو اللہ کا بندہ نہ بنالیں۔ بعد کی صدیوں میں اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھتا ہے کہ یہ جذبہ دھیرے دھیرے ختم ہو گیا۔ قریبی صدیوں میں جب اسلام کو زوال ہوا تو اس کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے کتنی ہی عالی شان تحریکیں اٹھیں۔ مگر کوئی بھی قابل ذکر تحریک دعوت الی اللہ کے مقصد کو لے کر اٹھنے والی نہیں ملتی۔

جو قرآن صحابہ و تابعین نے پڑھا تھا، وہی قرآن بعد کے لوگوں نے بھی پڑھا، پھر کیا وجہ ہے کہ جس قرآن نے اپنے اولین مخاطبین کے اندر دعوت اسلام کی آگ لگا دی تھی وہی قرآن بعد کے لوگوں کو دعوت کے عنوان پر کھڑا کرنے کا باعث نہ بن سکا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ صدر اول میں قرآن براہ راست طور پر لوگوں کے لئے علم دین کا ماخذ تھا۔ جب کہ بعد کے دور میں وہ انسانوں کے پیدا کردہ علوم کے ہالہ میں چھپ گیا۔

قرآن ایک اساسی کتاب ہے جس میں دین کے تمام بنیادی مسائل بتائے گئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ان اساسات کی بنیاد پر اس کی مزید تبئین (نحل - ۴۴) کر کے اس کو لوگوں کے لئے یسیر الفہم بنا دیا جائے۔ اس تبئین کا واضح نمونہ سنت رسول اللہ میں موجود تھا۔ مگر بعد کے دور میں قرآن کی تبئین و تفصیل نے سنت کے سادہ طریقے کے بجائے فنی طریقہ اختیار کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیدھے سادے دین محمدی کے بجائے ایک پیچیدہ قسم کا متوازی دین وجود میں آگیا جس کا تانا بانا فقہی اصطلاحات، متکلمانہ موشگافیوں اور متصوفانہ اسرار و رموز سے تیار ہوا تھا۔ تابعین، جنھوں نے اصحاب رسول سے دین کو پایا تھا، انھوں نے دین کو اس طرح فن بنانے پر سخت احتجاج کیا۔ ان کے نزدیک یہ یہود و نصاریٰ کی نقل تھی نہ کہ سنت محمدی کی پیروی۔ مگر عوام اور حکمراں چونکہ کیفیات دین سے خالی ہو چکے تھے، اس لئے تکنکل دین ان کے زیادہ حسب حال تھا، ان کی تائید کے زور پر وہ بڑھتا رہا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب طویل مدت گزر جائے تو ماضی

کی ہر چیز مقدس بن جاتی ہے۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ اس متوازی دین میں تقدس کا عنصر بھی شامل ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اب کوئی شخص یہ سوچ نہیں سکتا کہ فقہ کی کتابوں میں کوئی مسئلہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو قرآن و سنت کی منشا کے مطابق نہ ہو۔ صوفیا کے ملفوظات اور قصوں میں کسی غلطی کا بھی امکان ہے۔ یا مروجہ معقولات میں بھی کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جس کو غیر معقول کہا جائے ـــــــ اس کے بعد قرآن کو جہاں جگہ مل سکتی تھی، وہ صرف برکت کا خانہ تھا۔ وہ برکت کی حیثیت سے کتاب تلاوت بن کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے قرآن کی تفسیریں لکھیں، ان کے سامنے بھی یا تو "ثواب" حاصل کرنا تھا یا یہ تھا کہ فقہ، تصوف یا معقولات میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو خدا کی کتاب سے ثابت کر دکھائیں۔ الا ما شاء اللہ۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فقہ اور تصوف اور علم کلام کی شکل میں جو اضافے اسلام میں ہوئے، ان کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ قرآن کا سرا امت کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ان اضافوں نے دین کو ایک قسم کا فن بنا دیا۔ کتاب الٰہی میں جو چیز سادہ اور فطری انداز میں بتائی گئی تھی، اس میں اپنی طرف سے موشگافیاں کر کے نئے نئے مسئلے پیدا کئے اور بطور خود بے شمار اصطلاحات وضع کیں تاکہ ان کو فنی انداز میں بیان کیا جا سکے۔ اس طرح دین خداوندی ایسے احکام و مسائل کا مجموعہ بن گیا جو صرف فنی کتابوں کے مطالعہ سے جانا جا سکتا ہو۔ کتاب الٰہی کے ذریعہ اس کو معلوم کرنا ممکن نہ ہو۔

آج کسی کو نماز کے "مسائل" جاننا ہوں تو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ اس مقصد کے لئے قرآن کا مطالعہ کرے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نماز کے مسائل تو فقہ کی کتابوں میں ملیں گے۔ کسی کو روحانی ترقی مطلوب ہو تو اس کو کبھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ خدا کی کتاب لے کر بیٹھے اور اس میں روحانی سلوک کے طریقے تلاش کرے۔ وہ صرف یہ کرتا ہے کہ کسی "بزرگ" کے پاس پہنچ جاتا ہے، کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ فن روحانیت کے آداب تو فن روحانیت کے کسی ماہر ہی سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی کو یہ شوق ہو کہ وہ اسلام کی دعوت کو عقلی طور پر مدلل کرے تو وہ قرآن میں اس کے نکتے نہیں ڈھونڈے گا بلکہ معقولات میں غرق ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس فن کی باریکیاں صرف معقولات کی کتابوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں ـــــــ قرآن اس لئے اتارا گیا تھا کہ لوگ اس میں تدبر (ص ـ ۲۹) کر کے اپنے لئے رہنمائی حاصل کریں۔ مگر قرآنی تعلیمات کو فن بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن، کتاب تدبر نہ رہا، کتاب تلاوت بن گیا جس کا آخری استعمال یہ تھا کہ اس کو ہر روز یا ہر ہفتہ بس "ختم" کر لیا جایا کرے۔ لوگ اپنے دین کو اپنے احبار و رہبان سے اخذ کرنے لگے اور قرآن کو برکت کی چیز کی حیثیت سے جزدان میں لپیٹ کر رکھ دیا۔ ایسا ہونا بالکل فطری تھا۔ کیوں کہ جن نکتوں اور موشگافیوں کو انھوں نے دین سمجھ رکھا تھا، وہ قرآن کے اندر موجود ہی نہ تھے۔

خدا کی کتاب سے محرومی کا یہ معاملہ اسی حد پر نہ رکا بلکہ وہ ہماری پوری زندگی پر چھا گیا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری امور کی تفصیل بیان کر دی ہے (اسراء ـ ۱۲) وہ ہر معاملہ میں مومن کی ذہنی غذا ہے۔ مگر مذکورہ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ذہن ہی ختم ہو گیا کہ اسلام اور ملت اسلام کے تمام مسائل کو ہم قرآن میں تلاش کریں، قرآن کو خالی الذہن ہو کر دیکھئے تو بلا اشتباہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو جانے کہ مرنے کے بعد اسے

اپنے رب کے سامنے حساب کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ اس آنے والے دن سے تمام قوموں کو باخبر کرنا ہی امت محمدی کا اصل مشن ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں اٹھنے والی بے شمار تحریکوں میں سے کوئی بھی قابل ذکر تحریک ایسی نہیں جو اس خاص مقصد کو لے کر اٹھی ہو۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ احیائے اسلام کے لئے اٹھے، وہ اگرچہ عالم تھے اور قرآن کو پڑھتے تھے مگر ان کا شاکلہ فقہ اور تصوف اور علم کلام نے بنایا تھا۔ یہی چیز ہے جس نے قرآن کی صراط مستقیم سے لوگوں کو ہٹا دیا۔ ان میں سے جس کے اوپر کلامیات کا غلبہ تھا، اس کے ذہن میں خدمت دین کے شوق نے مناظرہ کی صورت اختیار کر لی۔ جو لوگ متصوفانہ ذہن رکھتے تھے، وہ خانقاہی طرز کی تعلیم و تربیت میں ملت کا مستقبل تلاش کرنے لگے۔ اسی طرح جن کا ذہن فقہ کے سانچے میں بنا تھا، وہ اسلام کو بطور ایک "نظام" کے دیکھنے لگے، جس کو بروئے کار لانے کی واحد شکل یہ تھی کہ حکومت الٰہیہ قائم کر کے اسلام کے دیوانی اور فوجداری قوانین کو نافذ کیا جائے۔ یہ نقطۂ نظر عوام تک میں اس طرح سرایت کر گیا کہ اسلام کے اصل کام کے لئے ان کے اندر کوئی اپیل نہیں رہی۔ ان کی فہرست میں صرف دو کام ثواب کے کام کی حیثیت سے باقی رہ گئے ——— مسجدوں اور مدرسوں کی تعمیر کے لئے چندے دینا، یا "بزرگوں" کی خدمت میں نذرانے پیش کرنا۔ ان کے سوا کوئی اور کام انھیں دینی کام نظر نہیں آتا، اس لئے اس میں ان سے تعاون کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

ایک خالی الذہن شخص ہمارے اسلامی کتب خانہ کو دیکھے تو وہ حیرت انگیز طور پر ایک اختلاف کا مشاہدہ کرے گا۔ یہ دینِ منزّل اور دینِ مدوّن کا اختلاف ہے جو بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ خدا کا دین قرآن و حدیث میں ایک سادہ اور فطری چیز نظر آتا ہے۔ وہ دلوں کو گرماتا ہے اور عقل میں جلا پیدا کرتا ہے۔ مگر یہی الٰہی علوم جب انسانی کتابوں میں مدون ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں تو اچانک وہ ایک ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں خشک بحثوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان میں نہ دلوں کے لئے گرمی ہے اور نہ عقل کے لئے روشنی۔ قرآن میں بھی فقہ ہے مگر وہ کنز الدقائق (ابو البرکات نسفی) کی فقہ سے مختلف ہے۔ قرآن میں بھی تصوف ہے مگر ضیاء القلوب (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) کے تصوف سے اس کو کوئی مشابہت نہیں۔ اسی طرح قرآن میں بھی معقولات ہیں مگر شمس بازغہ (ملا جیون جونپوری) کی معقولات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ علوم اسلامی کی تدوین بذات خود کوئی غیر مطلوب چیز تھی۔ وہ بلاشبہ مطلوب تھی۔ مگر اس نے بعد کی صدیوں میں جو رخ اختیار کر لیا وہ صحیح نہ تھا۔ اسلامی علوم کی تدوین تذکیری طرز پر مطلوب تھی نہ کہ فنی طرز پر، جیسا کہ عملاً وقوع میں آیا۔ دین کو ذکر و نصیحت کی خاطر آسان (قمر — ۱۷) بنایا گیا تھا، مگر ہم نے اپنی پیچیدہ بحثوں سے اس کو مشکل بنا دیا۔

قرآن کو ذکر یعنی نصیحت (یٰس — ۶۹) کہا گیا ہے۔ قرآن میں غور و فکر (ص — ۲۹) اور علمی اضافہ (زمر — ۳۹) نہی مطلوب ہے جس سے ذکر اور نصیحت حاصل ہو۔ مزید یہ کہ علوم قرآنی کی تفصیل و تبیین کس طرح کی جائے، اس کا بھی واضح نمونہ سنت رسول میں موجود تھا۔ کیونکہ آپ اس کے لئے خدا کی طرف سے مامور تھے (نحل — ۴۴) اور آپ نے اس کو

انتہائی مکمل شکل میں انجام دیا۔ یہ تمام چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ علوم اسلامی کی تدوین کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس میں فنی اضافہ کیا جائے یا اللہ اور رسول نے جو احکام دئے ہیں، ان میں مزید استخراج کر کے نئے نئے مسائل وضع کئے جائیں اور قرآن، جس میں امام غزالی کے نزدیک صرف پانچ سو احکام ہیں، اس کو پانچ سو ہزار احکام کا مجموعہ بنا دیا جائے۔ علوم اسلامی کی تدوین کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس میں بطور تبیین وتفصیل وہ چیزیں شامل کی جائیں جن میں ذکر اور نصیحت کا سامان ہو۔ قرآن میں ہم کو جو باتیں بتائی گئی ہیں، ان کے بارے میں جہاں یہ ہے کہ ان کو مضبوطی سے پکڑو، اسی کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کے بیانات پر غور اور تدبر کرو (ص-۲۹) قرآن میں تفصیلات اور معانی کی تلاش بجائے خود ایک پسندیدہ چیز ہے۔ مگر یہ تلاش تذکیر ونصیحت کے اجزا تلاش کرنے کے لئے ہونا چاہئے نہ کہ فنی تعینات اور قانونی فروعات ڈھونڈنے کے لئے۔

آج اگر کسی بستی کے لوگ دار الافتاء کو یہ مسئلہ لکھ کر بھیجیں کہ ہماری مسجد کا مسقف حصہ نمازیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے تنگ ہو رہا تھا اور مسجد کے موجودہ رقبہ میں اضافہ کی صورت نہ تھی۔ اس لئے ہم نے مسجد کے پورے صحن پر چھت ڈال دی۔ اب مشکل یہ پیش آگئی کہ مسجد میں صحن باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں کیا موسمی ضرورتوں کے تحت مسجد کی کھلی چھت کو نماز کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، تو ہمارا مفتی فوراً ایک شرعی مسئلہ کی حیثیت سے اس کا جواب دینے بیٹھ جائے گا اور لکھے گا کہ فلاں فلاں شرطوں کے ساتھ مسجد کی چھت کو نماز کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ ہر چیز کو "شرعی مسئلہ" بنانا قطعاً اسلام کے خلاف ہے۔ یہ تو وہ یہودیت ہے جس کو مٹانے کے لئے نبی آخر الزماں کو مبعوث کیا گیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانے میں یہ حال تھا کہ جب اس قسم کا کوئی سوال کیا جاتا تو سائل کو کوئی متعین جواب نہ دیا جاتا بلکہ یہ کہا جاتا کہ یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ اپنے حالات کے لحاظ سے جیسا مناسب سمجھو ویسا کر لو۔ احادیث وسیر کی کتابوں میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں کہ کسی سوال کے جواب میں "مسئلہ" بتانے کے بجائے خود سوال کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ مگر آج کے فقیہ اور مفتی کے یہاں اس قسم کا کوئی خانہ نہیں۔ اس کے یہاں ہر چیز ایک شرعی مسئلہ ہے اور ہر بات کے جواب میں وہ اپنی فقہ کی کتابوں سے کوئی نہ کوئی جزئیہ دریافت کر لیتا ہے جس کی روشنی میں وہ سائل کو مسئلہ کی شرعی صورت بتا سکے۔

نزول قرآن کے وقت یہود سے کہا گیا تھا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ — اعراف — ۱۵۷

یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

مطلب یہ کہ یہودی فقیہوں نے اپنی قانونی موشگافیوں سے اور ان کے روحانی مقتداؤں نے اپنے تورع کے مبالغوں سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں کے نیچے دبا رکھا ہے اور جن خود ساختہ بندشوں میں انھیں جکڑ رکھا ہے، یہ پیغمبر ان سے انھیں آزاد کرتا ہے اور دین خداوندی کو اس کی بے آمیز شکل میں ان کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ آج پیغمبر آخر الزماں کی امت خود انھیں "اصر واغلال" کے نیچے دب چکی ہے۔ ان کے فقہاء ومشائخ نے اسلام میں وہ سارے اضافے کر ڈالے ہیں

جو یہودی فقیہوں اور فریسیوں نے شریعت موسوی میں کئے تھے۔ آج اسلام کی تجدید کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو ان تمام اضافوں سے پاک کر دیا جائے۔ جب تک یہ کام نہ ہوا اسلام کو زندہ کرنے کی طرف کوئی اگلا قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔

خدا کے دین کو فن بنانا بظاہر ایک حسین یا کم از کم بے ضرر چیز معلوم ہوتا ہے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ نہایت سنگین ہے۔ یہ دلوں کے اندر قساوت پیدا کرتا ہے اور لطیف احساسات کو آدمی سے چھین لیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں خدا کا دین جس زبان میں ہے، وہ انذار و تبشیر کی زبان ہے، وہ تذکیر و نصیحت کی زبان ہے۔ یہ دونوں انداز ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہیں اور بالکل مختلف قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا انداز آدمی کو حقائق و معانی کی طرف متوجہ کرتا ہے، جبکہ ہمارے فنی علوم اس کو جزئیات میں مشغول کر دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے انداز سے آدمی کے اندر تفکر و تدبر پیدا ہوتا ہے جب کہ فنی علوم بحث و جدال کے لامتناہی دروازے کھول دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا انداز آدمی کے احساسات کو اس طرح جگاتا ہے کہ یوم الحساب کا مسئلہ اس کو سب سے بڑا مسئلہ نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس فنی علوم آدمی کو لایعنی قسم کی منطقی موشگافیوں میں الجھا کر اس کو زندگی کے اصل سوالات سے دور کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ فنی علوم، بظاہر جائز علوم ہونے کے باوجود، باعتبار نتائج اس مقصد کے لئے قاتل بن گئے ہیں جس کے لئے اللہ نے قرآن اتارا اور اپنا رسول بھیجا تھا۔

اس صورت حال کی اصلاح کی کوئی بھی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ قرآن و حدیث کو حقیقی معنوں میں لوگوں کے لئے دین اخذ کرنے کا ذریعہ بنا دیا جائے، جس طرح اب وہ فنون کی کتابوں سے اپنا دین اخذ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نماز کے بارے میں تمام بنیادی باتیں قرآن میں موجود ہیں۔ اس کے بعد اس کے ضروری مسائل حدیث اور آثار صحابہ میں مل جاتے ہیں۔ اب مسائل نماز پر ہماری جو کتاب لکھی جائے، وہ بس انھیں تینوں چیزوں (قرآن، سنت، آثار صحابہ) پر مشتمل ہو۔ اس کے سوا کسی بھی چیز کو نماز کے مسائل میں شمار نہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ ترجیح اور تفضیل کو بھی نہیں۔ کیونکہ صحابہ کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہونا اس مسئلہ میں دینی توسع کو بتاتا ہے نہ یہ کہ ایک صحیح ہے اور دوسرا غلط، ایک افضل ہے، دوسرا غیر افضل۔

ہمارے عربی کتب خانہ کی "امہات کتب" کا بیشتر حصہ وہ ہے جو اسی فنی زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔ فن فقہ، فن معقولات اور فن تصوف، بعد کو پیدا ہونے والے اسلامی لٹریچر پر اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جس طرح ہالہ چاند کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ نتیجۃً اگرچہ متن اسلام نہیں مگر علمی اور روایتی اسلام ٹھیک اسی طرح انسانی آمیزش کا شکار ہو گیا جس طرح دوسرے مذاہب اس کا شکار ہوئے تھے۔ جب تک یہ کتابیں علم دین کا ماخذ ہیں، کبھی یہ ممکن نہیں کہ صحیح تصور دین لوگوں کے دماغوں میں جگہ پا سکے۔ صحیح دینی فکر پیدا کرنے کے لئے ناگزیر طور پر ضروری ہے کہ قرآن و حدیث اور آثار صحابہ کو علم دین کا ماخذ بنایا جائے نہ کہ ان کتابوں کو جو ہمارے دار العلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے پہلا ناگزیر قدم یہ ہے کہ علوم قرآن، علوم حدیث اور آثار صحابہ کو از سر نو سادہ علمی انداز میں مرتب

کیا جائے اور فقہی اور معقولاتی اور متصوفانہ انداز کو ہمیشہ کے لئے ایک تاریخی چیز بنا دیا جائے۔ خدائی دین کو جب تک انسانی آمیزش سے پاک نہ کیا جائے، اسلام کا احیاء نہیں ہوسکتا۔

اسلام کی تدوین کا کام ایک دو شخص کے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی مجلس ہی کے ذریعہ انجام پاسکتا ہے جس میں معقول تعداد میں ایسے اہل علم جمع کئے جائیں جو نہ صرف قرآن و حدیث کو بخوبی جانتے ہوں بلکہ خالص علمی انداز سے مسائل کی تحقیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس طرح کی ایک ٹیم ایک ادارہ میں اکھٹا ہوکر مسلسل کام کرے اور اُس کو اِس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر قسم کے وسائل بافراط حاصل ہوں تو انشاء اللہ دس برس میں وہ ذخیرہ کتب تیار ہوسکتا ہے جو اسلام کو ازسر نو زندہ کرنے کی ایک حقیقی جد وجہد کے لئے فکری بنیاد کا کام دے۔ یہ امت اگر چاہتی ہے کہ قیامت میں اس کو امت محمدی کی حیثیت سے شمار کیا جائے تو اس کا پہلا لازمی فریضہ ہے کہ "ہدیٰ محمدی" کو انسانی آمیزشوں سے پاک کرکے اس کی خالص شکل میں لوگوں کے سامنے رکھ دے۔ موجودہ حالت میں اگرارادۃً نہیں تو علاوہ کتمان حق کی مجرم بن رہی ہے اور اس بات کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ کسی حامل کتاب گروہ کے لئے کتمان حق کے ساتھ کوئی بھی عمل اللہ تعالی کے یہاں مقبول نہیں ہوتا۔

حکمت کا تقاضا ہے کہ اس کام کو اجتماعی اہتمام کے ساتھ انجام دیا جائے۔ وہ علوم جو اجتماعی اہمیت کے حامل ہوں ان کی تدوین اجتماعی سطح پر ہی ہونا چاہیے تاکہ پوری ملت کے اندر ان کو مستند مقام حاصل ہو اور سارے لوگ ان کو قبول کرسکیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانہ میں جب ریاست کے تحت قرآن کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیا گیا اور اس کے بعد جو نسخے بچے ان کو جلا دیا گیا، تو اس کے اندر یہی حکمت تھی۔ جمع قرآن کا کام اگر انفرادی شخصیتوں کے ذریعہ انجام پاتا تو سخت اختلاف ہو جاتا اور پھر قیامت تک ختم نہ ہوتا۔

حدیث کی جمع و تدوین کے لئے بھی حضرت عمر بن عبد العزیز نے غالباً یہی منصوبہ بنایا تھا۔ انھوں نے مدینہ کے گورنر محمد بن عمرو بن حزم اور دوسرے گورنروں کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث اور سنت ملے ان کو جمع کرکے ضبط تحریر میں لائیں۔ مگر ان کی جلد موت کی وجہ سے خلافت کی ماتحتی میں یہ کام انجام نہ پاسکا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لوگ "ثواب" کے جذبہ کے تحت انفرادی طور پر اس کو کرنے میں لگ گئے۔ بہتر طریقہ یہ تھا کہ محدثین، خلفاء کے ذریعہ، جو ان کے بے حد عقیدت مند تھے، سرکاری انتظام کے تحت ایک ادارہ قائم کراتے جس میں محدثین کی منتخب جماعت اکھٹا ہوکر حدیث کی جمع و ترتیب کے سلسلے میں وہی کرتی جو قرآن کے سلسلے میں زید بن ثابت انصاری اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ اگر آغاز ہی میں معتبر احادیث کا ایک مجموعہ تیار کرکے باقی تمام "احادیث" کو نذر آتش کر دیا جاتا، تو امت بے شمار فتنوں سے بچ جاتی۔ فقہ کی تدوین کے سلسلے میں بھی صحیح طریقہ اسی اسوۂ صدیقی پر عمل کرنا تھا، بجائے اس کے کہ مختلف فقہاء الگ الگ اپنا مدرسہ فکر لے کر بیٹھ جائیں اور ایک خداوندی مذہب کو دس الگ الگ مذاہب میں تبدیل کر ڈالیں۔ اسی طرح علوم اسلامی کی تدوین کا جو کام ہمارے ذمہ ہے اس کو انجام دینے کا بھی صحیح طریقہ یہ ہے کہ اہل علم کی ایک ٹیم مقرر کی جائے اور وہ اپنی اجتماعی جد وجہد سے کتابوں کا ایک سٹ مرتب کرے۔ انفرادی طور پر اگر یہ کام کیا گیا تو اصل مدعا حاصل نہ ہوگا۔

A L - M A R K A Z - U L - I S L A M I (Regd.)

ISLAMIC CENTRE

JAMIAT BUILDING - QASINJAN STREET - DELHI 110006 (India)

تعارف

سمندر میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ کہا جاتا ہے۔ ان برفانی پہاڑوں کا دس میں سے نو حصّہ پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور صرف ایک حصّہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال انسانی زندگی کی ہے۔ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے دائمی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اور پھر اس کی زندگی کے نہایت مختصر حصہ ـــــ تقریباً سو سال ـــــ کو موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو آخرت کی دنیا میں ڈال دیا۔ موت وہ دروازہ ہے جس سے ہم، اپنی موجودہ مدتِ حیات پوری کرنے کے بعد، دوسری دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انسان کی کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کو اپنی زندگی بنائے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے وسائل اور اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرے جو اس کی زندگی کے اگلے مرحلے کو بہتر بنانے والا ہو۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کے تمام کارنامے اسی دنیا میں رہ جائیں گے اور موت کے بعد دوسری دنیا میں وہ اس حال میں پہنچے گا کہ آخرت کی طویل تر زندگی میں اپنی جگہ بنانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ ہوگا۔

یہی وہ نازک مسئلہ ہے جس سے انسان کو باخبر کرنے کے لیے خدا نے پیغمبروں کا سلسلہ جاری کیا۔ ہر دور میں خدا کے نمائندے آئے اور آسمانی کتابیں اتاری گئیں تاکہ موت کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے انسان کو بتا دیا جائے کہ اس کو بالآخر کہاں جانا ہے۔ اور اپنی مستقل کامیابی کے لئے اسے کیا کرنا چاہیئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ تاہم جہاں تک پیغمبرانہ کام کا تعلق ہے، اس کی ضرورت بدستور باقی ہے۔ آج بھی یہ مطلوب ہے کہ خدا کے بندوں کو اس اہم ترین حقیقت سے باخبر کیا جائے۔ تاکہ آخرت میں خدا کے اوپر کسی کی حجت باقی نہ رہے۔

خدا کے اس پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں ہے۔ اب امت مسلمہ اس کی ذمہ دار ہے۔ خاتم النبیین کی امت کا اصل مشن دنیا میں یہی ہے کہ وہ اس پیغمبرانہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اٹھے۔ یہ اس کا ایسا ناگزیر فریضہ ہے جس سے غفلت کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتی۔

اسلامی مرکز کا قیام اس لئے عمل میں آیا ہے کہ امت مسلمہ کو اس کی اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کرے اور تمام ممکن ذرائع سے حق کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔

یہ ایک باقاعدہ طور پر رجسٹرڈ ادارہ ہے اور ماہنامہ الرسالہ اسی کے آرگن کے طور پر جاری کیا گیا ہے۔

پیغام رسانی کا یہ عظیم کام صرف اس وقت موثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے جب کہ اس کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مکمل تیاری کی جائے اور اس کے لئے تمام ضروری تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ اسلامی مرکز نے اس سلسلے میں اپنے سامنے جو نقشہ کار رکھا ہے، اس کو مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مقاصد

۱- عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجراء جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جاسکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲- قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳- قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت۔

۴- حدیث، سیرت، حالاتِ صحابہ، تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵- ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶- اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷- مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸- اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹- علمی طرزِ فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰- جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱- ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

ضرورت ہے کہ اسلام
کو دنیوی مہم کے بجائے
اخروی مہم کے طور پر
سامنے لایا جائے

دعوتِ اسلامی ہی
ایک ایسا کام ہے جس
پر تمام مسلمانوں
کو
متحد کیا جا سکتا ہے

تقریباً ۴۰ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے کسی مسلم اخبار میں ایک تصویر دیکھی۔ یہ تصویر بیت المقدس کی تھی۔ اس تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

"ارضِ مقدس جس پر چالیس کروڑ مسلمانوں کی جانیں قربان ہیں"

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے، پچھلے برسوں میں، بے شمار تعداد میں ارض مقدس پر اپنی جانیں قربان کردی ہیں۔ مگر عملاً نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ ۳۰ سال پہلے ارض قدس کی جتنی زمین یہودیوں کے قبضہ میں تھی، آج اس کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ رقبہ پر وہ اپنا اقتدار قائم کر چکے ہیں۔ مزید حیرت یہ ہے کہ اس تیس سالہ مدت میں مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ۴۰ کروڑ سے بڑھ کر ۸۰ کرور ہو چکی ہے۔ مگر اپنے "دشمنوں" کے مقابلہ میں وہ کہیں بھی کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

تعدادی کثرت اور تحریکوں کے ہجوم کے باوجود مسلمان کیوں ناکام ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے اصل فریضۂ منصبی کو ادا نہیں کر رہے ہیں۔ مسلمان کے ساتھ خدا کے تمام اجتماعی وعدے اس شرط پر ہیں کہ وہ دنیا میں اُس اجتماعی کام کو انجام دیں جس کے لئے انھیں چنا گیا ہے۔ اگر وہ اِس کام کے لئے نہ اٹھیں تو وہ خدا کی نظر میں مجرم ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ کام کیا ہے۔ یہ کہ وہ تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ پیغام رسانی کا یہ کام کوئی قومی کام نہیں ہے، نہ اس کا سیاسی اور اقتصادی مفادات سے کوئی براہ راست تعلق ہے۔ یہ ایک خالص خدائی اور اخروی کام ہے۔ اللہ تعالے نے انسان کو امتحان کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیا میں ایک وقت تک زندگی کا موقع دینے کے بعد وہ تمام انسانوں کو آخرت میں حاضر

800 Million

28 countries of the world are predominantly Muslim. India has the third largest Muslim population after Indonesia and Bangladesh. Pakistan comes next. Europe has 25 million Muslims. The Arab World figure includes the Muslim population of Egypt and the rest of North Africa.

کرے گا اور وہاں ان کے حق کے مطابق ان کے نئے دائمی جنت یا دائمی جہنم کا فیصلہ کرے گا۔

خدا اگرچہ اپنے بندوں کے احوال سے خوب واقف ہے مگر اس نے اپنی اس عدالت کے لئے جو طریقہ مقرر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں خود انسانوں میں ایسے لوگ اٹھیں جو خدا کی طرف سے لوگوں کو آنے والے یوم الحساب سے باخبر کریں، یہ لوگ جو دنیا میں قوموں کو خدا کا پیغام پہنچائیں گے، یہی آخرت میں ان کے اوپر خدا کے گواہ بنیں گے۔ وہ آخرت کی عدالت میں کھڑے ہو کر کہیں گے کہ کس نے پیغام خداوندی کو مانا اور کس نے اس کا انکار کیا۔ ان کی گواہی کے مطابق خدا ہر ایک کے اوپر اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔

مسلمانوں کا اصل جرم یہ ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئے ہیں۔ وہ قوموں کے اوپر خدا کے گواہ بن کر نہیں کھڑے ہو رہے ہیں۔ خدا کو اپنی سنت کے مطابق اپنی عدالت کے لئے گواہ مطلوب ہیں (وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ آل عمران ۔ ۱۴۰) مگر سارا عالم اسلام اس ذمہ داری کو بھولا ہوا ہے۔ وہ اس خدائی منصوبہ میں اپنے کو شامل نہیں کر رہا ہے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے، بجائے کہ وہ خدا کی نصرتوں کے مستحق قرار پائیں۔

پچھلے برسوں میں پٹرول کی قدرتی طاقت نے بلاشبہ مسلم دنیا کو کافی سہارا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خداداد خزانہ اگر ظاہر نہ ہوا ہوتا تو مسلمان، حالیہ صدیوں میں اپنی بے حساب نادانیوں کی وجہ سے، آج بین اقوامی اچھوت کی سطح پر پہنچ چکے ہوتے۔ ہماری نام نہاد انقلابی تحریکیں کسی بھی درجہ میں ہم کو بچانے والی ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔

پٹرول کی طاقت نے مسلمانوں کو نہ صرف اقتصادی
اور سیاسی سہارا دیا ہے بلکہ وہ اعلانِ حق اور دعوتِ
دین کے کام میں بھی مددگار ہو رہا ہے۔ دو بلین پٹرو ڈالر
(۱۸۰۰ کروڑ روپے) کے خرچ سے ۱۹۷۶ میں لندن میں
جو ورلڈ آف اسلام فیسٹیول (مہرجان العالمی الاسلامی)
ہوا، اس کو دیکھ کر سیکڑوں یورپی باشندے مسلمان ہو گئے۔
ایک برطانوی اخبار نے اس مہرجان کی رپورٹ دیتے ہوئے
اس کو یورپ کے اوپر اسلام کا حملہ قرار دیا تھا۔ (السٹریٹیڈ
ویکلی ۱۸ جولائی ۱۹۷۶):

THE ISLAMIC INVASION IS UPON US

پٹرول کی اقتصادی قوت نے آج مسلم قوموں کو نئی
اہمیت دے دی ہے۔ ساری دنیا میں عربی زبان کو فروغ
حاصل ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جگہ جگہ اسلامی
مراکز کھل رہے ہیں۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا کام
بہت بڑھ گیا ہے۔ دنیا بھر میں اسلامی شخصیتوں اور
اسلامی اداروں کو پٹرول کے جادو نے نئی زندگی عطا
کر دی ہے۔ بین اقوامی اسلامی اجتماعات اتنی زیادہ تعداد
میں ہو رہے ہیں جن کا چند سال پہلے تصور نہیں کیا جا سکتا
تھا۔ افریقہ میں نہ صرف عوام میں اسلام پھیل رہا ہے بلکہ
حالیہ برسوں میں دو عیسائی حکمراں اسلام قبول کر چکے ہیں
—— یہ اور اس طرح کے دوسرے اسلامی اہمیت
کے واقعات جو آج ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ تمام تر
اس دولت کے کرشمے ہیں جو خداداد پٹرول کے ذریعہ اچانک
خلیج فارس کے مسلم ملکوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ حتی کہ حالیہ
برسوں میں مسلم قوموں کے اپنے مغربی آقاؤں کے مقابلہ
میں جو جرأت اختلاف پیدا ہوئی ہے، وہ بھی تمام تر
پٹرول کی خداداد طاقت کا کرشمہ ہے، مثلاً ترکی،
سعودی عرب اور پاکستان کا امریکہ کے مقابلہ میں،
اور مصر کا روس کے [illegible]۔

مگر ان باتوں میں ہمارے لئے بہت زیادہ خوشی
کا پہلو نہیں ہے۔ کیوں کہ "انسان" کا کام "پٹرول" انجام
دینے لگے تو یہ خدا کی طرف سے انسان کے خلاف عدم
اعتماد کا اظہار ہے۔ جب خدائی آواز بلند کرنے کے لئے
انسانوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں، اس وقت دابہ
(نمل ۔ ۸۲) زمین سے نکل کر امر حق کا اعلان کرتا ہے۔
مگر جب دابۃ الارض کی زبان سے خدا اپنا اعلان کرانے لگے
تو یہ خوشی کا نہیں غم کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد
زمین و آسمان کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے۔ انسان سے
زمین کا سرسبز کرہ چھین لیا جاتا ہے اور اس کو دھوئیں
اور آگ کی دنیا کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے جہاں وہ
ابدی طور پر "روتا اور دانت پیستا" رہے۔

مسیح علیہ السلام سے یروشلم کے یہودی علماء نے کہا کہ اپنے
شاگردوں کو منع کر دو کہ وہ ہمارے اوپر تبلیغ نہ کیا کریں۔
مسیح علیہ السلام نے جواب دیا:

اقول لکم انہ ان سکت ھولاء فالحجارۃ تصرخ
میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر یہ چپ ہو جائیں تو پتھر چلا اٹھیں گے
(لوقا ۱۹: ۴۰)

مطلب یہ ہے کہ خدا کے پیغام کو بہر حال بلند ہونا ہے۔
اگر وہ انسانوں کی زبان سے بلند نہیں ہوگا تو درخت
اور پتھر چلا کر اسے لوگوں کو سنائیں گے۔ مگر جب درخت
اور پتھر چلانے لگیں تو یہ انسانوں کے لئے موت کا وقت
ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے
اس کے بعد دو ہی چیزیں باقی رہتی ہیں یا جنت یا جہنم۔ یہ
امتحان کی کاپی چھین لینے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ پرچہ حل کرنے کا۔

برتر سطح سے کام کرنے کا ذہن پیدا کیجئے

کسی شہر میں کپڑے کی دوکان نہ ہو تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک سنہری موقع ہے جس کو استعمال کرکے کوئی شخص شہر میں ایک کامیاب دوکان کا مالک بن سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں ایک اس سے بھی زیادہ بڑا خلا ہے جس کو ابھی تک کسی نے استعمال نہیں کیا۔ ہمارے ملک کے بھرے ہوئے دفاتر اور ہمارے پر رونق بازار جہاں ہر وقت خرید و فروخت کے ہنگامے جاری رہتے ہیں اپنی ساری ہماہمی کے باوجود ابھی تک خالی ہیں۔

آپ بازار سے کوئی ملک کی بنی ہوئی چیز خریدیں، چند ہی روز کے تجربے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کو اپنی پسند کی چیز نہیں ملی۔ آپ اپنے کام کے لیے ملازم رکھئے، بہت جلد آپ محسوس کریں گے کہ آپ جیسا کارکن چاہتے ہیں، آپ کا ملازم ان اوصاف میں پورا نہیں اترتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بازار اگرچہ سامانوں سے پٹے ہوئے ہیں مگر وہ ان چیزوں سے خالی ہیں، جو حقیقتاً گاہک کو مطمئن کرنے والی ہوں۔ اسی طرح وہ جگہیں جہاں آدمی کو کام ملتا ہے اگرچہ بظاہر بھری ہوئی ہیں۔ مگر انھیں اب بھی ایسے کارکنوں کا انتظار ہے جو ان کی مرضی کے مطابق ان کا کام پورا کرسکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج سارا ملک ایک عظیم خلا سے دوچار ہے۔ اور یہ خلا اعلیٰ مصنوعات اور بہتر کارکردگی کا خلا ہے۔ اگر کوئی گروہ ہو جو محنت اور عملی دیانتداری میں اعلیٰ معیار دکھا سکے۔ جو مثال کے طور پر جرمنی اور جاپان میں نظر آتا ہے، تو وہ آناً فاناً ملک کی اقتصادیات پر چھا جائے گا اور جو گروہ اقتصادیات پر قابض ہو جائے وہ لازمی نتیجہ کے طور پر دوسرے شعبوں پر بھی قابض ہو کر رہتا ہے۔

کارکردگی کا خلاء پر کرکے آپ اپنے لئے جگہ حاصل کرسکتے ہیں۔

دنیا میں اپنی جگہ بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ——— جس آسامی کے لیے بی اے کی قابلیت کی شرط ہو اور بی اے والوں نے درخواستیں دے رکھی ہوں۔ وہاں آپ بھی اپنی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچ جائیں اور جب آپ کو نہ لیا جائے تو بحث کریں کہ کیوں آپ کے مقابلے میں دوسرے امیدوار کو ترجیح دی گئی جبکہ دونوں یکساں طور پر گریجویٹ تھے دوسری شکل یہ ہے کہ جہاں لوگ بی اے کی سندیں پیش کر رہے ہوں وہاں آپ ماسٹر ڈگری لے کر پہنچیں جہاں لوگ مطابقِ شرائط قابلیت کی بنیاد پر اپنا حق مانگ رہے ہوں وہاں آپ برتر از شرائط قابلیت دکھا کر اپنا حق تسلیم کرائیں۔

یہی دوسرا طریقہ زندگی کا اصل طریقہ ہے۔ تمام بڑی بڑی ترقیاں اور کامیابیاں انھیں کے لیے مقدر ہیں جو اس دوسرے طریقے کے مطابق کام کرنے کے لیے تیار ہوں ═══

ATOM - AS CONCIEVED BY SCIENTISTS

THE WORLD'S LARGEST RADIO TELESCOPE AT THE ARECIBO OBSERVATORY IN PUERTO RICO IS USED BY CORNELL UNIVERSITY ASTRONOMERS TO FIND AND IDENTIFY "QUASARS". (AMERICAN REVIEW, SUMMER 1974)

ستاروں کی دنیا

قدیم زمانہ میں ستاروں کی بابت انسان کا علم محض قیاسات و مفروضات پر مبنی تھا جن کو علم نجوم (ASTRALOGY) کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ سترھویں صدی میں دوربین کی ایجاد اور پھر نئے آلات کے استعمال کے بعد انسان کی معلومات میں اضافہ ہوا اور فلکیات (ASTRONOMY) وجود میں آئی۔ موجودہ زمانے میں فلکیات کا علم مزید آگے بڑھا ہے اور کائنات کے آغاز، اس کی تاریخ اور اس کے انجام کی بابت تحقیق کی جا رہی ہے۔ اس نئے علم کو کاسمولوجی (COSMOLOGY) کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ متعدد ذیلی علوم بھی پیدا ہوئے ہیں، مثلاً ریڈیائی فلکیات (RADIO ASTRONOMY) وغیرہ۔

کائنات کے فاصلے

کائنات کے فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو ان عام پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا جن کو ہم زمینی فاصلوں کو بتانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ فلکیات دانوں نے اس کے لیے ایک خاص پیمانہ وضع کیا ہے جس کو نوری سال (LIGHT YEAR) کہتے ہیں۔ روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ یعنی ایک سال میں ۶۰ کھرب میل۔ اسی فاصلہ کو فلکیات میں سال نور کہا جاتا ہے اور کائناتی فاصلوں کو ناپنے کے لیے اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔

سورج ہماری زمین سے روشنی کے نو منٹ کے فاصلہ پر ہے۔ یعنی اس کی روشنی مذکورہ رفتار سے سفر کر کے ہم تک نو منٹ میں پہنچتی ہے۔ زمین سے سورج کا فاصلہ ۹۳ ملین میل ہے۔ سورج کے بعد دوسرا ستارہ جو زمین سے سب سے زیادہ قریب ہے وہ الفا سنٹوری (ALPHA CENTAURI) ہے، وہ ۴،۳ نوری سال دور ہے۔ یعنی ۲۵۸ کھرب میل۔

ہماری کہکشاں جس میں تقریباً ۱۰۰ ہزار ملین ستارے ہیں، ایک عظیم پلیٹ کی مانند ہے جس کی موٹائی دس ہزار نوری سال ہے اس کا قطر (DIAMETER) تقریباً ایک لاکھ سال نور ہے۔ سورج ہماری کہکشاں کے مرکز سے ۳۳۰۰۰ نوری سال دور ہے۔ اس قسم کی کہکشائیں بے شمار تعداد میں ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فلکیات دانوں کا خیال ہے کہ کائنات کا دائرہ (RADIUS) کم از کم ۱۰ ہزار ملین سال نور ہے۔ اس وسیع کائنات میں فلکیات داں اپنی دوربینوں کے ذریعہ آٹھ ہزار ملین سال نور تک دیکھ چکے ہیں۔

جدید فلکیات

زمینی دوربینوں کی تصویری پلیٹ، ریڈیو ٹیلی اسکوپ کے ذریعہ وصول شدہ الکٹرانکس سگنل، راکٹ اور مصنوعی سیاروں میں لگے ہوئے آلات وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ خلاء میں ایسے اجسام بھی ہیں جن کی خصوصیات ان عام ستاروں سے بہت زیادہ مختلف ہیں جن کو اب تک انسان جانتا تھا۔

مثلاً وہ اجسام جن کو پلسار (PULSAR) کا نام دیا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ وہ ستارے ہیں جو جل کر بجھ چکے ہیں، یہ اتنی زیادہ کثیف (DENSE) حالت میں ہیں کہ ان کے ایک مربع انچ مادہ کا وزن ایک ہزار ملین ٹن کے برابر ہے۔ وہ ناقابل قیاس رفتار سے خلا میں گردش کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایسے اجسام ہیں جن کو بلیک ہول (BLACK HOLE) کہا جاتا ہے۔ یہ پلسار سے بھی زیادہ کثیف حالت میں ہیں۔ بلیک ہول انسان کے لیے ناقابل مشاہدہ ہیں کیونکہ ان کی کثافت کی وجہ سے ان کی قوتِ کشش اتنی طاقت ور ہوگئی ہے کہ روشنی بھی ان سے باہر نکلنے نہیں پاتی۔

اسی طرح کوسیار (QUASAR) ہیں۔ یہ ستاروں کی مانند ہیں۔ وہ کائنات میں سب سے زیادہ دور فاصلوں پر واقع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، ہزار ملین سورج سے زیادہ روشن ہے۔ ان سے جو بے پناہ قوتِ حرارت نکل رہی ہے، وہ علماء کے لیے حیرت و استعجاب کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ کوئیسار اتنے دور فاصلوں پر ہیں کہ علماء کا خیال ہے کہ ان کے مطالعہ سے شاید وہ کائنات کے حدود کو دریافت کر سکیں۔ اس طرح کی اور چیزیں ہیں مثلاً فلاٹسام (FLOTSAM) جس کے متعلق اندازہ ہے کہ وہ گیس اور گرد کے بادل ہیں، وغیرہ۔

ابھی حال تک سائنس داں آسمانی مشاہدوں کے لیے اسی قسم کی ٹکنیک پر بھروسہ کرتے تھے جو گلیلیو نے سترہویں صدی میں استعمال کی تھی یعنی ستاروں سے آنے والی روشنیوں کو دوربینوں کے ذریعے دیکھنا۔ مگر تجربات کے دوران معلوم ہوا کہ قابل مشاہدہ روشنی اصل کائنات کا بہت تھوڑا حصہ ہے۔ الکٹرانکس اور راکٹ سائنس کی ترقی نے فلکیات دانوں کو ایسے آلات دیئے جو آسمان میں ان کی واقفیت کو زیادہ دور تک لے جا سکتے تھے۔

۱۹۳۱ء میں بیل لیبورٹیری کے ایک انجنیر جانسکی (CARL JANSKY) نے پایا کہ اس کا ریڈیو انٹینا ایسے سگنل پکڑ رہا ہے جن کا کوئی ماخذ زمین میں نہیں ہے۔ جانسکی نے معلوم کیا کہ یہ سگنل آسمانوں سے آرہے ہیں اس طرح ریڈیائی فلکیات (RADIO ASTRONOMY)

وجود میں آئی جس کا مقصد تھا آسمانی اجسام سے آنے والی ریڈیائی لہروں کا مطالعہ کرنا۔ آج زمین پر متعدد ایسی رصد گاہیں وجود میں آچکی ہیں جہاں پلیٹ کی وضع کے بہت بڑے بڑے انٹینا لگے ہوئے ہیں۔ یہاں عالم بالا سے آنے والی ریڈیائی لہروں کو وصول کیا جاتا ہے اور ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

مزید مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ ریڈی ایشن کی اور بھی قسمیں ہیں۔ ایکس ریز۔ الٹرا وائلٹ ریز، انفرا ریڈ ریز، وغیرہ، یہ لہریں جو اوپر سے آتی ہیں، زمینی فضا میں جذب ہو جاتی ہیں۔ تاہم خلائی دور سے پہلے انسان کو اس کا علم نہ تھا۔ آج مصنوعی سیارے مختلف قسم کے آلات سے لیس ہو کر زمین کے گرد گھوم رہے ہیں اور اس قسم کی لہروں کو اخذ کر کے انسان کو ان سے باخبر کر رہے ہیں۔ اس طرح نئے نئے ذیلی علوم وجود میں آرہے ہیں مثلاً ایکس رے اسٹرانومی، الٹرا وائلٹ رے اسٹرانومی۔

موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں امریکی فلکیات داں ہبل (EDWIN P. HUBBLE) نے ماؤنٹ ولسن (کیلی فورنیا) کی ایک سو انچ قطر کی دوربین کو استعمال کر کے دریافت کیا کہ کائنات پھیل رہی ہے جیسے کسی غبارے میں ہوا بھری جائے اور وہ پھیلتا چلا جائے۔ فلکیاتی اصطلاح میں اس کو ریڈ شفٹ (RED SHIFT) کہا جاتا ہے۔

مگر اس پھیلنے کی وجہ کیا ہے۔ بلجیم کے سائنس داں لیماٹر (ABBE GEORGES - LEMAITRE) نے ۱۹۲۷ء میں اس کا ایک جواب دیا۔ اس نے کہا کہ بہت پہلے کائنات کی ابتداء میں پوری کائنات کا مادہ ایک نہایت منجمد ٹکڑے کی صورت میں تھا اس کو اس نے سپر ایٹم (SUPERATOM) کا نام دیا۔ اس کے بعد یہ سپر ایٹم پھٹا۔ اس کا مادہ چاروں طرف پھیلنا شروع ہوا۔ لمبے زمانوں کے بعد مادہ کا یہ طوفان کہکشاؤں، ستاروں اور سیاروں کی شکل میں جمع ہو گیا اس انفجار کو اب بگ بینگ (BIG BANG) کہا جاتا ہے۔

کائنات کا آخری انجام کیا ہے فلکیات داں قیاس کر رہے ہیں کہ کائنات کا پھیلاؤ دھیرے دھیرے کم ہوگا۔ اس کے بعد رک جائے گا اور اس کے بعد سکڑنا شروع ہوگا اس مفروضہ کے مطابق کائنات کا آخری انجام یہ ہوگا کہ وہ دوبارہ سمٹ کر ایک سپر ایٹم کی صورت اختیار کرے گی۔ اگرچہ ان دونوں عملوں میں دسیوں بلین سال لگ جائیں گے۔

پرنسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر وہیلر (JOHN WHEELER) نے حساب لگایا ہے کہ کائنات بالآخر سکڑ کر بلیک ہول کی صورت

میں منجمد ہو جائے گی اور پھر پھٹ جائے گی، اور دوبارہ پھیلنے کا وہی عمل شروع ہو گا جو آغاز میں اس کے ساتھ ہو چکا ہے۔

۱۹۴۸ء میں برطانی فلکیات دانوں نے اپنے مطالعہ کے دوران پایا کہ بالائی خلا میں انرجی کا انشقاق (BURSTS) ہو رہا ہے، یہ انشقاق اتنا زیادہ معین وقت پر ہوتا تھا کہ انھوں نے قیاس کیا کہ یہ کسی دوسری تہذیب (CIVILIZATION) کے ارادی عمل کا نتیجہ ہے جو خلا میں کسی مقام پر انسان کے علاوہ پائی جاتی ہے۔ ان سے جو ریڈیائی لہریں آ رہی تھیں ان میں اتنی زیادہ صحت تھی کہ ۱/۱۰ ملین کے بقدر ان سے گھڑی کو صحیح کیا جا سکتا تھا بعد کو علماء فلکیات نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ریڈیائی لہریں ایک نئے قسم کے ستاروں سے آ رہی تھیں جن کو نیوٹران اسٹار کا نام دیا گیا۔ انھیں ستاروں کا دوسرا نام پلسار ہے۔

رابرٹ ایم ہیلینگ کا خیال ہے کہ بلیک ہول دراصل وہائٹ ہول ہیں جو ہماری ایک پڑوسی کائنات (NEIGHBORING UNIVERSE) میں واقع ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ کائنات کے آخری انشقاق کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمام اجرام مل کر ایک کائناتی بلیک ہول کی صورت اختیار کر لیں گے اور پھیلاؤ اور انجماد اور انشقاق کا ایک نیا عمل شروع ہو گا۔

کوئیسار (QUASARS) کا معاملہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ اجرام تمام دوسرے ستاروں سے بہت زیادہ بعید فاصلے پر واقع ہیں اس کے باوجود وہ دکھائی دیتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت بڑی تعداد میں روشنی خارج کر رہے ہیں۔ تقریباً ۱۰ ملین ملین سورج کے برابر۔ اب تک ۲۰۰ کوئیسار دریافت ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ زمین سے ان کا فاصلہ ۱۲ ہزار ملین سال نور ہو۔ اس سے مراد وہ فاصلہ ہے جو روشنی بارہ ہزار ملین سال میں طے کرے جب کہ وہ ۱۸۶۲۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہو۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ کوئیسار شاید کائنات کا آخری کنارا ہو اور شاید وہ سب سے قدیم آسمانی اجسام ہوں۔ ہمارے معلوم طبیعی قوانین کے تحت ان ناقابل قیاس اجرام کی توجیہہ نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ وقت آگیا ہے کہ طبیعیات کے نئے قوانین دریافت کیے جائیں جو نئے دریافت شدہ حالات پر چسپاں ہو سکیں۔

کائناتی شواہد کی توجیہہ کے لیے نئے طبیعی قوانین کی ضرورت کا اظہار کر کے جدید سائنس داں دراصل اسی بات کو دہرا رہے ہیں جو اس سے پہلے نیوٹن نے کہی تھی:

"سیاروں کی گردش کی توجیہہ کے لیے صرف معلوم فلکیاتی قوانین کا حوالہ کافی نہیں

اس کے لیے ایک "خارجی بازو" کو ماننا بھی ضروری ہے۔"

آخر میں ایک امریکی میگزین کا اقتباس ملاحظہ ہو:

IS THE FATE OF A BLACK HOLE THE ULTIMATE FATE OF THE UNIVERSE ? WHEELER BELIEVES SO. IN SOME BILLIONS OF YEARS, THE GALAXIES WILL RUSH TOGETHER, FORMING ONE MASSIVE BLACK HOLE WHERE THE LAWS OF THE UNIVERSE THAT EXIST TODAY WILL BE 'NOT BROKEN, BUT TRANSCENDED', WHEELER SAYS. IN SUCH SPECULATION, COSMOLOGY BEGINS TO APPROACH METAPHYSICS.

The American Review,
Summer 1974

کیا بلیک ہول کا انجام ہی کائنات کا آخری انجام ہے۔ وہیلر کا خیال یہی ہے۔ کچھ بلین سال میں ایسا ہوگا کہ کہکشائیں کھنچ کر ایک دوسرے میں مل جائیں گی۔ ان کے ملنے سے ایک بڑا بلیک ہول تیار ہوگا جہاں موجودہ کائناتی قانون "ٹوٹ نہیں جائے گا بلکہ برتر صورت اختیار کرلے گا" یہ وہیلر کا کہنا ہے۔ اس قسم کے نظریات کے بعد کائناتی سائنس مابعد الطبیعیات سے قریب ہوجاتی ہے۔

قرآن میں ہے کہ زمین وآسمان باہم ملے ہوئے تھے (گویا سپر ایٹم کی حالت میں تھے) پھر اللہ نے ان کو پھاڑ دیا (بگ بینگ کا انفجار ہوا) پھر جس طرح تخلیق کا آغاز ہوا اس کو وہیں لوٹا دیا جائے گا (کائنات دوبارہ سپر ایٹم کی صورت اختیار کرلے گی) اس کے بعد نئے زمین وآسمان کی تخلیق ہوگی (کائناتی قانون بہتر صورت اختیار کرلے گا) قرآن میں جو کچھ کہا گیا تھا سائنس کس قدر صحت کے ساتھ اس کی تصدیق کر رہی ہے!

سائنس مابعد الطبیعات سے قریب

موجودہ زمانہ میں ایک نئی اصطلاح وجود میں آئی ہے جس کو (ETC) کہتے ہیں۔ یہ ایک انگریزی لفظ کا مخفف ہے

EXTRA-TERRESTRIAL CIVILISATION

بالائی تہذیب۔ موجودہ زمانہ کے سائنسی مطالعہ سے انسان کے علم میں ایسے واقعات آرہے ہیں جو اس کو یہ یقین کرنے پر مجبور کررہے ہیں کہ زمین کے علاوہ بھی خلا میں کہیں ذہین ہستیاں ہیں۔ مثلاً بالائی خلا سے نہایت صحت کے ساتھ سگنل موصول ہوتے ہیں جن کے مطالعہ کے لیے ایک مستقل فن (ریڈیو اسٹرونومی) وجود میں آئی ہے۔ جدید مشاہدات سے ثابت ہوا ہے کہ نظریۂ ارتقا ارضی زندگیوں کی توجیہہ کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ چنانچہ اب یہ قیاس کیا جارہا ہے کہ زمین پر زندگی کسی بالائی کرہ سے آئی ہے جہاں ہم سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب موجود ہے اس نظریہ کو پینس پرمیا کا نام دیا گیا ہے

آج کل کثرت سے ایسے مضامین اور کتابیں چھپ رہی ہیں جن کا موضوع یہ ہوتا

ہے کہ کیا کائنات میں کسی دوسرے مقام پر بھی زندگی موجود ہے۔ ایک اخبار نے ایک مضمون چھاپا جس کا عنوان تھا

HELLO! HELLO! ANYONE OUT THERE

(کیا اوپر کوئی ہے) ایک ڈچ ریاضی داں (H. FREUDENTHAL) نے ۱۹۶۰ء میں ایک کائناتی زبان تجویز کی تھی جو خلائی باشندوں سے گفتگو میں کام آسکے۔ اگرچہ ۱۷–۱۹ ویں صدی کو میں ہر سیارہ حتیٰ کہ سورج بھی زندگی کا مسکن سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب کائنات کے دوسرے مقامات پر جس زندگی کا یقین کیا جا رہا ہے، وہ پہلے سے بہت مختلف اور معنی خیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے علوم اس کو دوبارہ خدا کے عقیدہ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ البتہ وہ "خدا" کا نام نہ لے کر "ترقی یافتہ تہذیب" کا نام لے رہا ہے، شاید تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے۔

حبش کی ہجرت

نبوت کے پانچویں سال مکہ میں مسلمانوں کے حالات بہت سخت ہو گئے۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر قریش نے ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ایک نئی تحریک شروع کی۔ انھوں نے لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ کوئی شخص مسلمانوں سے کوئی چیز نہ خریدے، نہ ان کے ہاتھ بیچے۔ نہ ان کی لڑکی سے نکاح کرے، نہ اپنی لڑکی ان کے نکاح میں دے۔

قدیم مکہ میں اس قسم کا معاشی اور سماجی بائیکاٹ زندگی کو مفلوج کر دینے کے ہم معنی تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ حبش میں ایک انصاف پسند بادشاہ کی حکومت ہے تم لوگ وہاں چلے جاؤ۔ مسلمان چھوٹی جماعتیں بنا کر حبشہ جانا شروع ہوئے۔ کیونکہ اجتماعی شکل میں گھر سے نکلنے میں یہ اندیشہ تھا کہ قریش رکاوٹ ڈالیں گے۔

جدہ کے ساحل سے کرایہ کی کشتیوں میں سوار ہو کر ان لوگوں نے بحر قلزم پار کیا اور حبش میں اتر گئے۔ وہاں تجارت اور مزدوری کر کے گزر اوقات کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر تقریباً ایک سو آدمی مکہ سے نکل کر حبش گئے تھے۔

قریش کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر حبش چلے گئے ہیں تو انھوں نے اپنے دو آدمی عمرو بن العاص اور عمارہ بن ولید کو مقرر کیا کہ وہ حبش جائیں اور بادشاہ کو آمادہ کریں کہ وہ مسلمانوں کو قریش کے حوالے کر دے۔

قریش کا یہ وفد تحفہ تحائف لے کر حبش پہنچا اور شاہ نجاشی کے سامنے اپنی درخواست پیش کی۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تمہارا اس مسئلہ میں کیا جواب ہے۔ جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے بولے "اے بادشاہ مکہ یا عرب کے کسی دوسرے مقام پر ہم نے چوری نہیں کی ہے، نہ کسی کو قتل کیا ہے اور نہ کوئی دوسرا ظلم کیا ہے" شاہ حبش نے قریش کے وفد سے پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا: ان کا کہنا صحیح ہے۔ انھوں نے چوری اور قتل جیسا کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ہمارا الزام صرف یہ ہے کہ انھوں نے باپ دادا کے دین کو بدل ڈالا ہے۔

سلیمان بن عبدالملک (م ۹۹ھ) کی منقبت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے خلافت راشدہ کی زریں فہرست میں پانچویں خلیفہ راشد (عمر بن عبدالعزیز) کا اضافہ کیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسی اموی حکمراں کے خانہ میں تاریخ ان واقعات کو بھی لکھتی ہے جن کا آخری نتیجہ ان دو عظیم ترین المیوں کی شکل میں برآمد ہوا جن میں سے ایک کا نام اسپین اور دوسرے کا نام ہندوستان ہے۔ اگر سلیمان بن عبدالملک نے اسپین میں طارق کو اور ہندوستان میں محمد بن قاسم کو معتوب کرکے واپس نہ بلایا ہوتا تو شاید ان دونوں ملکوں کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو بعد کے دور میں ہمیں نظر آتی ہے۔

اسپین میں کیا ہوا

سلیمان بن عبدالملک نے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ محض ایک ذاتی شکایت کی بنا پر موسیٰ بن نصیر گورنر افریقہ اور اس کے سپہ سالار طارق بن زیاد (فاتح اسپین) کو ان کے عہدوں سے معزول کرکے واپس بلا لیا۔ اور اول الذکر کو قید اور دوسرے کو نظر بند کر دیا۔ اس کے فطری نتیجہ کے طور پر اسپین کی مسلم حکومت اور مرکز خلافت کے درمیان آغاز ہی میں حریفانہ جذبات پیدا ہو گئے۔ ۱۳۲ھ میں جب ایک خون آشام انقلاب کے بعد دمشق کی اموی سلطنت ختم ہوئی اور نئے دارالخلافہ بغداد میں عباسی خلافت قائم ہوئی تو اموی خاندان کا ایک لٹا ہوا شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل اسپین پہنچا اور وہاں کے حالات سے فائدہ اٹھا کر اسپین میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بنوامیہ کے ایک فرد کی یہ کامیابی عباسیوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس طرح اسپین اور مرکز خلافت کے درمیان رقابت کی ایک اور وجہ پیدا ہو گئی اور نتیجۃً باہمی آویزشوں کا وہ لامتناہی سلسلہ چلا جو صرف اس وقت ختم ہوا جب اسپین میں خود مسلم سلطنت ختم ہو گئی۔

مرکز خلافت اور اسپین کی یہ رقابت یہاں تک بڑھی کہ جس خلافت نے طارق بن زیاد کو بھاری کمک دے کر اسپین کی مہم پر بھیجا تھا اسی خلافت نے فرانس کے بادشاہ شارلیمین کو اکسایا کہ وہ اسپین پر حملہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین میں ایک عام خانہ جنگی اور بغاوت کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر علاقہ کا گورنر خود مختاری کا خواب دیکھنے لگا۔ امیر قرطبہ کے رشتہ داروں نے اس نازک وقت کو اسپین کے تاج و تخت کے لیے سازش کرنے کا سنہری موقع سمجھا۔ مقامی عیسائیوں کو شہ ملی کہ وہ باغی مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہر جگہ شورش پیدا کرتے رہیں۔ اسپین کی اموی خلافت کے بعد اسپین کا ملک چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں میں تقسیم ہو گیا جنھوں نے قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، بلنسیہ، طلیطلہ، البقاوغیرہ شہروں کو اپنا اپنا دارالحکومت بنا لیا۔

طارق بن زیاد ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں اسپین میں داخل ہوا تھا اور ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں اسپین سے مسلم

اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ آٹھ سو برس کی اس طویل مدت کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو بغاوتوں اور شورشوں سے خالی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ اسپین کو اکثر بہت لائق مسلم حکمراں ملے۔ عدل وانصاف کے اعتبار سے بھی اور تمدن و سیاست کے اعتبار سے بھی۔ اور بلاشبہ انھوں نے مشکل حالات کے باوجود تمدن اور سیاست دانی کے اعتبار سے اسپین میں ایک عظیم تاریخ بنائی۔ مگر اندرونی حالات اور مرکز خلافت کی شہ کی بنا پر ملک کی عیسائی رعایا مسلسل بغاوتوں پر مائل رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ ماحول نہ بن سکا جس میں اس اہم ترین کام کی بنیاد پڑتی جس کے لیے اسلام نے کشورکشائی اور جہاں بانی کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ یعنی اشاعت دین کا کام۔ عرب اور اطراف عرب کے اکثر ممالک جتنی مدت میں مکمل طور پر اسلامی آبادی کے ملک بن گئے اس سے بہت زیادہ مدت پانے کے باوجود اسپین اسلامی آبادی کا ملک نہ بن سکا۔

اسپین میں مسلم حکومت کی مثال تقریباً ویسی ہی ہے جیسے آزادی سے قبل ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی مثال۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے سوسالہ دور حکومت میں ملک کو زبردست تمدنی ترقیات سے مالا مال کیا۔ اگرچہ انھوں نے وہ غلطی نہیں کی جو اسپین کے مسلمانوں نے کی تھی۔ انھوں نے سارے ملک میں عیسائی مشنریوں کا جال بچھا دیا اور ان کو بے پناہ سہولتیں عطا کیں مگر مسیحی مذہب میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اس ملک کی آبادی کو اپنا ہم عقیدہ بنا لیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہندوستان سے انگریزوں کی ہوا اکھڑی تو عالی شان عمارتیں اور بڑے بڑے پل ان کے کام نہ آسکے اور انھیں ہندوستان چھوڑ کر وطن واپس جانا پڑا۔

طارق بن زیاد نے جس اسلامی جذبے کے تحت اسپین کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اگر وہ جذبہ جاری رہتا اور وہاں مستحکم حکومت کی روایت قائم ہوسکتی تو اسپین میں مسلمانوں کے سوا کسی کا وجود نہ ہوتا۔ دریا پار کرنے کے بعد اپنی طویل دعا میں اس نے رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا کی آیت بطور بد دعا نہیں دہرائی تھی۔ بلکہ یہ اپنے اس عزم کا اظہار تھا کہ وہ اس ملک کو کفر وشرک سے خالی کرکے اسلام کا گہوارہ بنا دینا چاہتا ہے۔ مسلم اسپین کی ابتدائی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مگر چند ہی برس بعد وہاں کی سیاست کا رخ اس طرح بدلا کہ تبلیغ دین کا کام پس پشت پڑ گیا۔ ۱۳۲ھ میں جب مرکز خلافت میں تبدیلی ہوئی اور بنوامیہ کی جگہ بنو عباس کی سلطنت قائم ہوئی تو اس ذہن کو مزید تقویت ملی۔ کیونکہ عباسیوں کو جتنی دلچسپی تمدن اور علوم وفنون کی ترقی سے تھی اتنی دین کی اشاعت سے نہیں تھی۔ اس طرح بغداد کے اثر سے قرطبہ تمدن اور علوم وفنون کا مرکز تو بن گیا مگر وہ اشاعت دین کا مرکز نہ بن سکا۔

چنانچہ اسپین میں جب حالات بدلے تو وہاں کی مسلم اقلیت پر عیسائی اکثریت آناً فاناً غالب آگئی اور الحمرا کا بے مثال محل مسلمانوں کے کچھ کام نہ آسکا۔ چونکہ عام آبادی میں عیسائیوں کو غلبہ حاصل تھا اس لیے ۹۰۴ھ میں قرطبہ کو زیر کرنے کے بعد جب مسلمانوں کے خلاف دارو گیر شروع ہوئی تو ان کے لیے وہاں چھپنے کی

بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ عیسائیوں نے غالب آتے ہی تمام ملک میں اپنی مذہبی عدالتیں قائم کر دیں جن میں ہر روز ہزاروں مسلمان گرفتار کر کے لائے جاتے اور طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر آگ میں جلا دیے جاتے۔ ۹۰۴ھ میں ایک عام حکم جاری کیا گیا کہ ہر وہ شخص جو مسلمان ہے وہ دین مسیحی قبول کرلے ورنہ جہاں اس کو پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ کچھ مسلمان جہازوں پر سوار ہو کر افریقہ کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ آخر کار کوئی ایک بھی توحید پرست سرزمین اسپین میں باقی نہ رہا۔ عیسائیوں نے سب کو یا تو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ یا سمندر میں ڈبو دیا۔ یا آگ میں جلا ڈالا۔

(۲)

خلفائے اربعہ کے بعد اسلامی حکومت بنی امیّہ کے ہاتھ میں چلی گئی جس کے بانی امیر معاویہ (وفات ۶۰ھ) تھے اس سلسلۂ حکومت کا پانچواں فرماں روا عبدالملک بن مروان تھا۔ ۸۶ھ میں عبدالملک کا انتقال ہوا۔ انتقال سے پہلے اس نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ اس نے تمام صوبوں کے گورنروں اور عاملوں کے نام فرامین جاری کیے کہ عید الفطر کے اجتماع میں یکم شوال ۸۶ھ کو ولید و سلیمان کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی جائے۔ چنانچہ تمام ممالک اسلامی میں تاریخ مقررہ پر ان دونوں کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی گئی۔ یہی موقعہ ہے جب کہ مدینہ کے مشہور محدث سعید بن مسیب کو بیعت سے انکار کرنے پر درے لگائے گئے۔

عبدالملک بن مروان (۸۶-۲۳ھ) کے انتقال کے بعد جب اس کا بڑا لڑکا ولید تخت پر بیٹھا تو اس نے یہ کوشش شروع کی کہ اپنے بعد تخت کی وراثت اپنے بھائی (سلیمان) کے بجائے اپنے بیٹے (عبدالعزیز) کی طرف منتقل کر دے۔ ولید بن عبدالملک نے پہلے اپنے بھائی سلیمان کو لکھا کہ وہ از خود ولی عہدی سے دست بردار ہو جائے۔ جب سلیمان اس کے لیے تیار نہ ہوا تو اس نے دوسری تدبیر کی۔ اس نے تمام والیان ملک اور ممتاز افراد کو اپنے حق میں ہموار کیا اور طے کیا کہ ایک روز کسی خاص اجتماع کے موقع پر تمام ممالک اسلامی میں سلیمان بن عبدالملک کی ولیعہدی کی منسوخی کا اعلان کر دیا جائے اور اس کے بجائے عبدالعزیز بن ولید کی ولیعہدی پر لوگوں سے بیعت لے لی جائے۔

مگر اس منصوبہ کی تکمیل سے پہلے ۱۵ جمادی الثانی ۹۶ھ (فروری ۷۱۵ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ولید بن عبدالملک کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو قدرتی طور پر وہ ان سرداروں کا دشمن ہو گیا جنھوں نے اس کو تخت سے محروم کرنے کی سازش میں اس کے بھائی ولید کا ساتھ دیا تھا۔ انھیں میں سے ایک حجاج بن یوسف تھا جو مشرق کے اسلامی ممالک کا وائسرائے تھا اور مغربی ممالک کا وائسرائے موسیٰ بن نصیر۔ حجاج کا صدر مقام عراق تھا اور موسیٰ بن نصیر کا قیروان۔ ان دونوں نے ولید کے منصوبہ کی حمایت کی تھی اس لیے دونوں سلیمان کی نظر میں وہ بدترین دشمن تھے جن سے سب سے پہلے نمٹنا نئے حکمراں کے لیے ضروری تھا۔ حجاج، سلیمان بن عبدالملک کی تخت نشینی سے آٹھ ماہ پہلے شوال ۹۵ھ میں انتقال کر گیا تھا۔ اس لیے

سلیمان اب حجاج بن یوسف کو نہیں پا سکتا تھا۔ تاہم حجاج کے رشتے دار اس کے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے موجود تھے جن میں سر فہرست حجاج کے ابن عم اور داماد محمد بن قاسم کا نام تھا جس نے سندھ (موجودہ پاکستان) میں غیر معمولی فاتحانہ کارنامے دکھا کر حجاج کی شہرت میں اضافہ کیا تھا۔

محمد بن قاسم نہایت اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھنے والا سپہ سالار تھا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں "اس نے سندھ و ہند کی فتوحات میں ایک طرف اپنے آپ کو رستم و اسکندر سے زیادہ بڑا بہادر ثابت کیا تو دوسری طرف نوشیروان عادل سے بڑھ کر عادل و رعایا پرور ظاہر ہوا" یہ نوجوان فتح مند سردار سندھ و پنجاب میں اتنی تیزی سے گھس رہا تھا اور بستیوں کی بستیاں اس کے اثر سے اس طرح دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب سارا علاقہ ایک اسلامی علاقہ بن جائے گا۔

ہندوستان کی مہم پر محمد بن قاسم کو حجاج ہی نے روانہ کیا تھا اس کے لیے حجاج نے کتنا اہتمام کیا تھا اس کا اندازہ چند مثالوں سے ہوگا۔

۱۔ حجاج نے دیگر تمام ساز و سامان کے علاوہ ۳۰ ہزار دینار خصوصی طور پر محمد بن قاسم کے ہمراہ کیے تھے تاکہ ناگہانی ضرورت کے وقت کام آسکیں (دبیر معصوم) کہا جاتا ہے کہ فوج کشی کی اس مہم پر کل ۶ کروڑ درہم صرف ہوئے تھے۔

۲۔ فراہمی سامان کا حجاج کو اس قدر خیال تھا کہ اس نے سوچا کہ محمد بن قاسم کو عربوں کی عادت کی بنا پر کھانے میں سرکہ کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ اس نے بہت سی روئی سرکہ میں تر کر کے خشک کرایا اور اس کو محمد بن قاسم کے پاس روانہ کیا اور لکھا کہ جب سرکہ کھانے کا جی چاہے تو اس کو پانی میں بھگو کر نچوڑ لیا کرنا

۳۔ پانچ منجنیقیں جو بھاری ہونے کی وجہ سے خشکی کے راستے سے روانہ نہ ہو سکتی تھیں، ایک بڑے جہاز پر لدوا کر ساحل سندھ کی طرف روانہ کیں۔ یہ منجنیقیں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کو چلانے کے پانچسو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی

۴۔ اس پوری مہم کے دوران حجاج اور محمد بن قاسم کے درمیان ڈاک کا سلسلہ جاری رہا۔ حجاج بصرہ میں تھا اور محمد بن قاسم سندھ میں۔ مگر انتظام یہ تھا کہ ہر تیسرے روز ایک خط حجاج لکھتا تھا اور اسی طرح محمد بن قاسم بھی ساری مصروفیتوں کے باوجود ہر تیسرے روز حجاج کے نام مفصل حالات تحریر کرتا۔ ڈاک کی روانگی کے لیے ایسے خاص انتظامات کیے گئے تھے کہ اگرچہ دیبل (سندھ) اور بصرہ میں ہزاروں کوس کا فاصلہ تھا۔ مگر برابر ساتویں روز بصرہ سے دیبل اور دیبل سے بصرہ دونوں کے خطوط پہنچ جاتے تھے۔

محمد بن قاسم نے ۹۵ھ میں ملتان فتح کیا۔ اب پورا سندھ اس کے قبضہ میں تھا۔ بحر عرب سے لے کر حدود کشمیر تک تمام راجاؤں اور سرداروں نے اسلام کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اب اس نے پورے برصغیر میں اسلام کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور قنوج کی طرف کوچ کرنا شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ قنوج پر قبضہ کرنے کے بعد

بقیہ علاقوں کی فتوحات کا دروازہ کھل جائے گا۔ مگر ۹۶ھ میں سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔ اس کو حجاج کے متعلقین سے حجاج کا بدلہ لینا تھا۔ اس نے ایک طرف حجاج کے بعد یزید بن مہلب کو عراق کا والی مقرر کیا اور ایک خارجی المذہب صالح بن عبدالرحمٰن کو خراج وصول کرنے کی خدمت سپرد کی۔ یہ دونوں حجاج کے بدترین دشمن تھے۔ چنانچہ سلیمان کے حکم کے مطابق ان دونوں نے نسل عقیل (خاندان حجاج) کے لوگوں کو طرح طرح سے ماخوذ کر کے قتل کرنا شروع کیا۔

دوسری طرف سلیمان نے محمد بن قاسم کو ولایت سندھ سے معزول کرنے کا حکم جاری کر دیا جس کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ حجاج بن یوسف کا ابن عم اور داماد تھا اور حجاج کا نامور عزیز ہونے کی بنا پر اس کو ہلاک کر کے سلیمان اپنے انتقامی جوش کو ٹھنڈا کر سکتا تھا۔ سلیمان نے محمد بن قاسم کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ نیا حاکم دربار خلافت کا حکم لے کر سندھ پہنچا۔ اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کیا اور مجرموں کی طرح اس کو ٹاٹ کے کپڑے پہنائے۔ ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈالیں اور معاویہ بن مہلب کی حراست میں عراق روانہ کیا۔ یہ بھی محمد بن قاسم کی سعادت مندی تھی۔ ورنہ سندھ میں وہ اتنا مقبول تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم سے بغاوت کر کے خود یزید اور مہلب کو گرفتار کر سکتا تھا۔

فتوح البلدان کے بیان کے مطابق عربی کا مشہور شعر اسی وقت محمد بن قاسم کی زبان پر جاری ہوا تھا:

اضاعونی وای فتی اضاعوا　　لیوم کریھۃ وسداد ثغر

(لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جوان کو ضائع کیا۔ وہ جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کو محفوظ رکھے)

اس کے بعد محمد بن قاسم کو دمشق لے جایا گیا۔ وہاں سلیمان کے حکم سے وہ واسط کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ اس پر داروغہ جیل کی حیثیت سے صالح بن عبدالرحمٰن مسلط تھا جس نے اس کو جیل میں طرح طرح کی تکلیفیں دے کر مار ڈالا

ایک مورخ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے؛

”اگر ولید بن عبدالملک کی زندگی کچھ روز اور وفا کرتی۔ یا سلیمان ہی عقل و ہوش سے کام لے کر محمد بن قاسم کو چھوڑ دیتا تو شاید ایشیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔“

یہی مورخ مزید لکھتا ہے ”محمد بن قاسم کے زمانہ میں خلقت خدا کثرت سے اسلام قبول کرتی جا رہی تھی۔ تبلیغ دین کی جو سچی اور صحیح کوشش اس نے چند روز میں کر کے دکھا دی۔ بعد کی بڑی بڑی سلطنتیں صدیوں میں بھی نہ کر سکیں۔ اس نوعمر سپہ سالار نے چند روز کی حکمرانی میں جو گہرا اثر ڈال دیا تھا۔ ویسا اثر پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانچ سو برس میں بھی ملک پر نہیں ڈال سکیں۔ سندھ کے علاوہ بقیہ ملک میں آج مسلمان تھوڑے ہیں اور ملک پر کوئی اثر نہیں رکھتے۔ بخلاف اس کے سندھ میں سب سے بڑا غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہے اور یہ صرف عربوں اور خاصتہً محمد بن قاسم کی دین ہے۔“

"الاسلام، اسلوب تحریر اور موادِ استدلال دونوں کے اعتبار سے آج کی کامیاب ترین کتاب ہے۔ میں علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کا گہرا مطالعہ کریں، اور ایک درسی کتاب کی طرح اس سے فائدہ اٹھائیں"

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

مکرمی مولانا صاحب، سلام مسنون

شدید انتظار کے بعد آپ کی بہترین کتاب "الاسلام" میرے پاس پہنچ گئی، اس کتاب کے مسودہ پر میں نے سرسری طور پر نظر ڈالی تھی، اس وقت سے مجھے اس کتاب کا انتظار تھا۔ مصروفیت کے باوجود اس دور کی یہ اہم علمی، تبلیغی اور اصلاحی کتاب سفر و حضر میں ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے اور میں اسے بہت غور و فکر کے ساتھ آہستہ آہستہ سمجھ سمجھ کر پڑھ رہا ہوں۔ صفحہ ۱۳ پر آپ نے لکھا ہے:

"پہلے جزء کے سلسلہ میں اہم ترین کام یہ ہے کہ اسلام کے عقائد و احکام کو جدید استدلالی انداز میں مرتب کیا جائے تاکہ وہ لوگوں کو "آج کی چیز" معلوم ہونے لگیں، نہ یہ کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ وہ اس دور کی چیز ہیں جب کہ انسان قبائلی دور میں سانس لیتا تھا"

میں "الاسلام" کے فاضل مصنف کو مبارکباد اور ساتھ ہی دعائیں دیتا ہوں کہ اس نے الاسلام کو اسلوب تحریر اور استدلالی مواد دونوں کے لحاظ سے "آج کی کامیاب ترین چیز" بنا دیا ہے۔ دین برحق کے ایک ایک عنوان کے تحت مسائل شریعت کو الاسلام کے فاضل مصنف نے اس موثر انداز سے سمجھایا ہے کہ وہ دل و دماغ میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اہم کتاب عام مسلمانوں سے زیادہ علماء اسلام کے لئے ایک اہم تربیتی اور تعلیمی کتاب ہے۔ دین کی تعلیم اور تبلیغ کا کام کرنے والے حضرات اس کتاب کو سمجھ کر پڑھیں، ہر قسم کا تکلف دور کر کے اس کی ایک ایک سطر کا مطالعہ کریں اور مولانا وحید الدین خاں صاحب نے جس جدید اسلوب سے قرآن و حدیث کی باتیں پیش کی ہیں اس انداز کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں سمونے کی کوشش کریں۔

میں نے مولویانہ تعلّی سے علیحدہ ہو کر اس کتاب کو اپنے سرہانے رکھ چھوڑا ہے اور اس کے ایک ایک دو دو صفحے ایک طالب علم کی طرح سمجھ سمجھ کر روزانہ پڑھتا ہوں۔ میں اپنے طبقہ کے ساتھیوں اور خاص طور پر نوجوان علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ الاسلام کا گہرا مطالعہ کریں اور اسے ایک درسی کتاب سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اخلاق حسین قاسمی دہلوی۔ ۳ ر اگست ۱۹۷۷ء

الرسالہ کے سلسلے میں قارئین کے تعریفی خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں ہم ایک قاری کا خط نقل کر رہے ہیں جو اس سے پہلے ہم سے سخت قسم کا فکری اختلاف رکھتے تھے۔ الرسالہ کے مسلسل مطالعہ کے بعد انھوں نے اپنے احساسات مندرجہ ذیل الفاظ میں تحریر فرمائے ہیں۔

خدا آپ کے سکون و اطمینان کو بحال رکھنے کے لیے آپ کو ہر پریشانی سے محفوظ رکھے تاکہ اللہ کی منشا کی بات آپ بہتر سے بہتر طور پر بندگانِ خدا کے سامنے رکھ سکیں۔ خدا آپ کی خوب سے خوب تر مدد کرے۔ آمین۔ واقعی آپ نے میرا دل جیت لیا ہے اب میں آپ سے بہت خوش ہوں۔ کل آپ سے ناراضی کی بنیاد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھی جس کی بنیاد پر اب خوش ہوں۔ خدا اپنا کرم کرے۔ مجھے آپ کی باتیں (مضامین کی شکل میں) ایسی لگ رہی ہیں جیسے حقیقت کا خزانہ یہی ہیں۔ اللہ آپ کی مدد کرے اور ہر برائی کے اندیشے سے محفوظ رکھے۔ "آپ نے دل جیت لیا" کا مطلب ان معنوں میں نہیں ہے کہ کسی مخالف کے ساتھ اچھا برتاؤ کر کے اپنا بنا لیں۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ میں آپ کی باتوں کا بغور مطالعہ کر کے اس میں حقیقت کی روشنی پا رہا ہوں اور میرا یہ یقین بن چکا ہے کہ اسی طریقہ کو اپنا کر اسلام کو صحیح معنوں میں غالب کیا جا سکتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ اس مشکل راستے کو اپنا سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ مجھ سے اکثر ناراض رہے ہیں اور اب تو اور بھی اس میں شدت پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں معقولیت نام ہو جذباتیت اور خود پسندی کا وہاں معقولیت کی امید عبث ہے۔ اللہ آپ کی مدد کرے، میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت اچھی سمجھ دی ہے۔ بس اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس کو سنبھال رکھیے۔ ورنہ بہت سے شیطان پسندی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اسی لیے اپنی پسند سے آگے جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے اپنے دین کو بچائے۔ اللہ تعالیٰ الرسالہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا کرے کاش کہ لوگ سمجھیں —

الرسالہ میری نظر میں ایمان و اسلام کا خزانہ لیے ہوئے ہوتا ہے بلکہ خدا پسندی کا آفاقی سامان لیے ہوتا ہے۔ میں جب بھی پڑھتا ہوں تو میرا دل بے ساختہ آپ کو دعائیں دیے بغیر نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تازہ شمارہ کا انتظار قریبی تاریخوں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ آپ کو اس کا خوب بدلہ عطا کرے۔ اور اس کو ہر بندۂ خدا تک پہنچنے کا سامان اور مخالفین کو سوچنے کی توفیق عطا کرے۔ "سب سے بڑا اعتماد خدا پر اعتماد ہے"۔ یہ مضمون پڑھنے کے بعد مجھے اپنی لکھی بات مناسب نہیں معلوم ہوئی کہ ایسے آدمی سے نصیحت کی بات کروں جو خود ایسی گہری باتیں جانتے ہیں۔

آج آپ کا یہ مضمون پڑھ کر دل نے بہت دعائیں دیں: "دعوت اسلامی کے جدید امکانات" ایک ایک سطر کئی بار پڑھا۔ اور بڑی خوشی ہوئی مضمون بہت اچھا لگا۔ اللہ آپ کی مدد کرے ——

"الاسلام"، واقعی آپ کا ایک غیر معمولی کارنامہ
ہے اور خدائے تعالیٰ اس کو قبولیت کا درجہ
عطا فرمائے (اپنی بارگاہ میں) میں اس کی باتوں
سے متفق ہی نہیں اس کے عام ہونے کا خواہش مند
ہوں۔ انشاء اللہ آج نہیں تو کل یہ مقبول عام ہو کر
رہے گی۔ اور اسلام کو سربلندی اسی طریقے سے
مل سکتی ہے۔ اگر یہ کتاب میں پہلے دیکھتا تو آپ کا
میرا اختلاف کبھی نہیں ہوتا۔ میں آپ کا پہلے سے
بھی شخصی طور پر بہت قدر داں ہوں۔ لیکن میرے
ذہن میں آپ کی طرف سے یہ بات بہت کھٹکتی تھی
کہ "خدا پسند حکومت کے قیام کی ضرورت نہیں" جبکہ
میرے خیال میں خدا ہی اس زمین کا خالق اور مالک
ہے تو پھر اس زمین پر دوسروں کی مرضی کیسے —؟
پھر ایک اچھی حکومت کے بغیر انسانی حقوق کا تحفظ بھی
ممکن نہیں .... مگر اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ
کہ آپ خدا پسند حکومت کے مخالف نہیں بلکہ اس
طریقہ کے مخالف ہیں جس سے وہ کبھی قائم نہیں ہو سکتی
اور موجودہ واقعات بھی آپ ہی کی بات کی تصدیق
کرتے ہیں۔ مجھے آپ کی بات پوری طرح پٹ گئی
ہے یعنی میں نے اس کو پوری طرح تسلیم کر لیا ہے۔
کتاب الاسلام کے بارے میں میرا خیال ہے کہ دین
پہنچانے کی ذمہ داری کے تحت الاسلام ہی کو پیش
کر دینا کافی ہے — "حرف آخر" بھی بہت معقول
لگا۔ اب تو واقعی الرسالہ کے بعد کوئی پرچہ اچھا
نہیں لگتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ آج ہماری سب
سے اہم ضرورت یہی ہے کہ ہم مسلمان بنیں اور مسلمانی
کو عام کریں۔

بلند فکری

جب تیز ہواؤں کا طوفان آتا ہے تو چھوٹی چڑیاں
اس کے اندر گھر کر رہ جاتی ہیں۔ مگر جو بڑی چڑیاں
ہوتی ہیں، وہ اپنے قوی بازوؤں کے ساتھ اڑ کر اوپر
چلی جاتی ہیں۔ اور اس طرح طوفان کے دائرے
سے باہر نکل جاتی ہیں۔ اس واقعہ کی روشنی میں
یہ امریکی مثل ہے: بگ برڈ آف دی اسٹارم
(طوفان کی بڑی چڑیا)

اسی طرح سوچنے کی بھی دو سطحیں ہیں۔ کچھ
لوگوں کی سوچ ان کے قریبی حالات کے دائرہ
میں بنتی ہے۔ ان کا فکر ان کے آس پاس کے
واقعات کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ وہ جن حالات
میں گھرے ہوئے ہیں ان سے اٹھ کر سوچ نہیں
پاتے۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو "طوفان کی
بڑی چڑیا" کی طرح اپنے قریبی حالات سے
اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ وہ حالات سے متاثر ہو کر
نہیں سوچتے بلکہ حالات سے بلند ہو کر اپنی رائے
قائم کرتے ہیں۔

اس دوسرے طرز فکر کو کوئی نام دینا ہو
تو شاید یہ کہنا صحیح ہو گا کہ بڑی چڑیا کے انداز
پر سوچنا (BIG BIRD THINKING)

خلیج کے کنارے

متحدہ عرب امارات سمندر کے اس حصّہ کے شمال مشرقی سرے پر واقع ہیں جس کو عرب خلیج عرب کہتے ہیں اور ایرانی خلیج فارس۔ سات ریاستوں پر مشتمل اس وفاق کا یہ نام ۱۹۷۱ء سے لیا جانے لگا۔ اس سے پہلے اس وفاق کا ہر حصّہ اپنی الگ الگ امارت کے نام سے موسوم تھا، انہی سات ریاستوں میں سے ایک ابوظہبی ہے جس کے امیر شیخ زاید بن سلطان النہیان متحدہ عرب امارات کے صدر ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں وہ ابوظہبی کے حکمراں مقرر ہوئے تھے۔

ایران اور عمان کی طرح متحدہ عرب امارات کے غوطہ خور قدیم زمانہ میں سمندر سے موتی نکالنے کا کام کرتے تھے۔ آج بھی اس علاقہ میں آپ کو کوئی نہ کوئی ایسا شخص ملے گا جو فخر کے ساتھ آپ کو بتائے گا کہ اس کا کس سنہ کا نکالا ہوا کون سا موتی کس تاج دار یا تاجر کی کلاہ کی زینت بن چکا ہے۔ مگر آج موتی نکالنے کا یہ قیمتی پیشہ ختم ہو چکا ہے۔ جاپان میں پالش شدہ مصنوعی موتیوں کی صنعت نے جنم لیا اور ۱۹۳۹ء سے اس نے دنیا کی موتی کی منڈیوں کو پاٹنا شروع کر دیا۔ جاپان کے ان مصنوعی موتیوں نے خلیج کے موتیوں کی صنعت کو بالکل ختم کر دیا کچھ عرصہ تک یہ علاقہ سخت بیروزگاری کا شکار رہا کیونکہ یہاں موتی اور ماہی گیری کے سوا کسی قسم کی کوئی صنعت یا تجارت نہ تھی۔ مگر اس کے بعد اس علاقہ میں تیل کی دولت نکل آئی جس نے اس علاقہ کو پہلے سے ہزاروں گنا زیادہ مالا مال کر دیا۔ آج عرب امارات میں تعلیم اور علاج مکمل طور پر مفت ہے۔ بیروزگاروں اور معذوروں کو مستقل وظیفے دیے جاتے ہیں اور بے شمار طریقوں سے حکومت اپنے شہریوں کی مدد کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ماہی گیری، زراعت، جہازرانی کو جدید ڈھنگ سے ترقی دی جا رہی ہے۔ وہ علاقہ جو پہلے ہر قسم کی زرعی پیداوار کے لیے مکمل طور پر درآمدات کا محتاج تھا۔ آج کئی قسم کی سبزیاں اور پھل برآمد کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ سڑکیں، بندرگاہیں، کارخانے، اسپتال، جدید طرز کے شہر ہر روز اس چٹیل میدان سے ابھر رہے ہیں۔

لوگوں کے پاس سننے والے کان ہوں تو سچائی کو بتانے کے لیے کسی اعلان کی ضرورت نہیں، کائنات کی خاموش زبان ہر آن سچائی کو اس سے زیادہ بہتر طور پر نشر کر رہی ہے جو کوئی انسان اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ کر سکتا ہے۔

تعارف و تبصرہ

تحفۃ اللبیب شرح شیم الحبیب

تالیف : مولانا نیاز محمد صاحب

صفحات ۲۱۰، قیمت آٹھ روپے

شمائل نبوت کا موضوع بہت ایمان افروز موضوع ہے۔ متقدمین نے اس پر کثرت سے کتابیں لکھی ہیں جن میں امام ابوعیسیٰ ترمذی (م ۲۷۰ھ) کی کتاب سب سے زیادہ کامیاب سمجھی جاتی ہے۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (۱۲۴۵ھ-۱۱۶۲ھ) کی شمائل نبوی پر ایک مختصر کتاب ہے جس کا نام ہے شیم الحبیب۔ زیر نظر تالیف، اسی عربی کتاب کی عربی شرح ہے۔ یہ کتاب، مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر کافی جامع ہے اور فاضل شارح کی مفصل تعلیقات نے اس کو مکمل بنا دیا ہے۔ مولانا کی محنت اور تحقیق کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ موصوف نے شمائل نبوت پر بعض ایسی حدیثیں بھی تلاش کر کے نقل کی ہیں جو عام شرحوں میں نہیں پائی جاتیں۔

مولانا نیاز محمد صاحب (پیدائش ۱۹۱۹ء) علاقہ میوات کے مشہور علماء میں سے ہیں۔ نوح (ضلع گوڑگاؤں) میں ایک عربی مدرسہ کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ زیر نظر شرح کے علاوہ آپ نے اور بھی متعدد کتابیں تالیف کی ہیں جو سب کی سب شروح اور حواشی پر مشتمل ہیں۔

زیر نظر کتاب اپنی مفصل تعلیقات کے ساتھ محض شیم الحبیب کی شرح نہیں ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ مختلف علوم سے متعلق قیمتی نکتے بیان ہوتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۴۰-۳۸ پر حضرت حسنؓ کے بارے میں مفید تاریخی معلومات درج ہیں۔ اسی طرح مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے تھے (دائم البشر) دوسری طرف حدیث یہ بتاتی ہے کہ آپ مسلسل غمگین رہتے تھے۔ کوئی چیز آپ کی راحت کا باعث نہیں ہوتی تھی (کان متواصل الاحزان لیس لہ راحۃ)

اس کی تشریح صاحب کتاب نے نہایت فطری انداز میں کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جب آپ ملاقاتیں کرتے اور لوگوں کے درمیان ہوتے تو آپ ہشاش بشاش چہرہ کے ساتھ ان سے ملتے۔ جب آپ تنہا ہوتے تو اس وقت آپ پر ذمہ داری کا احساس غالب رہتا اور آپ غم میں ڈوب جاتے (صفحہ ۱۴۷)

حجازی نغمے

از مولانا حکیم عبدالشکور شاکر گیاوی

صفحات ۶۴، قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

پتہ: شاکر گیاوی ماہی شاپ بٹوپیہ بازار، جمشید پور

یہ حمد و نعت اور ملی نظموں کا مجموعہ ہے۔ پوری کتاب میں اصلاحی اور اسلامی نظمیں شامل ہیں۔

احکام الجمعہ

از مولانا عبدالرحیم ڈبڈبڈوی

صفحات ۵۶، قیمت: ایک روپیہ

پتہ: مدرسہ احیاء العلوم، ڈبڈبڈ، ضلع گوڑ گاؤں (بر راستہ پونا ہانہ)

اس کتاب میں جمعہ اور نماز جمعہ کے مسائل پر مفصل بحث کی گئی ہے اور حضرات مفتیان عظام کے فتاوی شامل کردیے ہیں۔ آغاز کتاب میں مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کی رائے حسب ذیل الفاظ میں درج ہے:

"احقر محمد میاں نے یہ رسالہ پڑھا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب (ڈبڈبڈوی) نے جس جذبہ سے یہ رسالہ لکھا ہے وہ قابل قدر ہے جو باتیں اس میں لکھی گئی ہیں ان کے حوالے درج ہیں جو صحیح ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی محنت اور لگن کو قبول فرمائے اور اس کے بہتر نتائج ظاہر ہوں۔"

الاستغفارات المنقذۃ من النار

باہتمام مولانا محمد سراج الدین گنگوری

صفحات ۴۹، قیمت ۲/۵۰ روپے

پتہ: مدرسہ رحیمیہ اسلامیہ عربیہ، درگاہ صاحب خان پیر قصبہ پہاڑی، ضلع بھرت پور، راجستھان

اس کتاب میں توبہ، استغفار کے فضائل اور ہفتہ کی سات منزلیں درج ہیں۔ یہ کتاب مدت سے نایاب تھی۔ مولف نے کوشش کرکے اس کو حاصل کیا اور اس کو عمدہ کتابت اور آفسیٹ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر مسلمہ خانم

آپ کو ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی

ایک شخص نے ایک دیہاتی آدمی کو دیکھا ساٹھ سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ خوب تندرست اور سرگرم دکھائی دیتا تھا "آپ کی صحت کا راز کیا ہے"۔ اس نے پوچھا۔ دیہاتی کا جواب یہ تھا:

"میرے من میں جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں تو میں ہمیشہ نہ کھاؤں کو ترجیح دیتا ہوں۔"

یہ بات جو ایک دیہاتی ان پڑھ نے بتائی، یہی بات سقراط نے ان لفظوں میں کہی تھی "اس وقت تک نہ کھاؤ جب تک تم بھوک سے بے تاب نہ ہو جاؤ۔"

غذا ہی میں انسان کی طاقت ہے مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ غذا ہی آدمی کی ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ غلط خوراک یا ناقص خوراک جتنی مضر ہے اتنی ہی مضر یہ بات بھی ہے کہ آدمی بھوک کے بغیر کھائے یا ضرورت سے زیادہ اپنے پیٹ کو بھرے۔ صحت کا راز ایک لفظ میں صرف یہ ہے:

"صحیح خوراک معتدل مقدار میں"

اگر آدمی صرف اس ایک اصول کو پوری طرح پکڑ لے تو اس کو زندگی بھر ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

Regd. No. D (D) 532
REGD. R. N. No. 28822/76
SEPTEMBER – 1977

Single Copy Rs. 2.00

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

مؤلف :
مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد مع پلاسٹک کور پندرہ روپے

قیمت مجلد بغیر پلاسٹک کور تیرہ روپے

دین کی حقیقت، تعلیمات قرآن کی حکمتیں، سیرت رسول کا انقلابی سبق
موجودہ زمانہ میں اسلام کے مسائل، دین کا تجدید و احیاء
امت مسلمہ کی تعمیر، دعوت اسلامی کے جدید امکانات —

ان موضوعات کے گہرے مطالعہ کے لئے "الاسلام" پڑھئے۔
جدید سائنٹفک اسلوب میں، نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور۔

اداروں، طالب علموں، نیز کم آمدنی والوں کے لئے غیر معمولی رعایت
تاجروں اور ایجنٹوں کے لئے خصوصی کمیشن

قیمت — بذریعہ منی آرڈر بھیج کر طلب فرمائیں
کتاب کی روانگی کا ڈاک خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا۔
بیرونی ممالک کے لئے تیس روپے یا اس کے مساوی رقم

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی-۶

AL-DARUL ILMIYYA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)